طاہر مسعود

برگردنِ راوی

بر گردنِ راوی

طاہر مسعود

مکتبہ تخلیقِ ادب - کراچی

پہلا ایڈیشن ——— ۱۹۸۶ء

تعداد ——— ایک ہزار

مطبع ——— عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد نمبر ۱۔ کراچی

کتابت ——— یونس نیازی

قیمت ——— ۳۰ روپے

مکتبہ تخلیقِ ادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۴۴۸ کراچی

اپنے پیارے بھائیوں
سید خالد مسعود اور سید پرویز فاروق کے نام

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم دُکھ ہی میں نہیں
سُکھ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔

ترتیب

نمبر شمار	صفحہ نمبر

جواز

یہ میرے چار سال کے عرصے میں لکھے گئے کالموں کا انتخاب ہے۔

میں بنیادی طور پر کالم نویس نہیں ہوں۔ اخباری ضرورت نے ایک نومشق صحافی سے یہ سارے کالم لکھوائے تھے جنھیں اس توقع پہ یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ شاید یہ ایک بار اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جا سکیں۔ اِن کالموں میں مسائل اور چیزوں کے بارے میں مخصوص قسم کا رومانی رویّہ کارفرما نظر آئے گا جس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ لکھنے والا ابھی عُمر اور تجربے کی مختلف منزلوں اور مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ چند ایک کالموں کا پیرایۂ اظہار سراسر افسانوی ہے لیکن یہ افسانے نہیں، کالم ہی ہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کالم کا کوئی متعیّن اسلوب نہیں ہوتا۔

بیشتر کالم روزنامہ "جسارت" کے اِدارتی صفحے پر "دامِ خیال" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ جناب محمد صلاح الدین کی اِدارت میں اس اخبار نے مجھے لکھنے کے لئے جو بے پایاں مواقع اور آزادی مہیّا کی اسے میں ہمیشہ احساسِ ممنونیت کے ساتھ یاد رکھوں گا۔

معدودے چند کالم روزنامہ "جنگ" کے اِدارتی صفحے پر "برگردنِ راوی" کے مستقل عنوان کے تحت چھپے تھے اور اب اس کتاب کا حصّہ ہیں۔ کتاب میں شامل بیشتر کالموں کی

تاریخِ اشاعت درج کردی گئی ہے ماسوائے اُن چند کالموں کے جن کی تاریخیں اُن کے تراشوں کو محفوظ کرتے ہوئے لکھی نہ جا سکیں اور اب اُنھیں اخبار کی فائلوں سے ڈھونڈنا میرے لئے ممکن نہ ہو سکا۔

ان کالموں کا انتخاب ہمارے عزیز دوست فراست رضوی نے کیا ہے لہٰذا برُے بھلے کی ذمّہ داری انہی کے سَر ہے۔ میں اُن کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ برادرم یونس نیازی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے اِن کالموں کی معنوی خامیوں کو اپنی خوش نویسی سے دور کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔

آخری بات یہ کہ اگر یہ کتاب آپ کو پسند آتی ہے تو سمجھیے میری محنت ٹھکانے لگی بصورتِ دیگر اِس کا شمار بھی انہی کتابوں میں کر لیجئے گا جنھیں پڑھنے کی ہمت مصنّف کے علاوہ کسی اور میں نہیں ہوتی لیکن ایسی کتابیں سال کی سال چھپتی ضرور ہیں۔

طاہر مسعود

زولوجیکل گارڈن میں

کل میں فرصت نکال کر مسٹر اینڈ مسز سلیمان بجلی والا سے ملنے بنگلے پر گیا۔ دونوں میاں بیوی گھر پر موجود تھے۔ نہایت خوش دلی سے استقبال کیا۔ ان کے پُرتپاک رویے سے لگ رہا تھا کہ انھوں نے میری اچانک آمد کا اپنے دل میں بُرا نہیں منایا ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں موسم کے موضوع پر خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ دریچے کے راستے دو خرگوش اچھل کر اندر آ گئے۔ میں نے انھیں اخلاقاً اپنے سے قریب بُلا کر پیار سے پُشت پر ہاتھ پھیرنا چاہا تاکہ مسٹر اینڈ مسز بجلی والا کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور وہ خوش ہو جائیں لیکن بد بخت خرگوشوں نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور بھاگ گئے۔ "بہت شرمیلے ہیں!" مسز سلیمان نے پیار سے کہا۔ "نہایت نادر قسم کے خرگوش لگتے ہیں۔" میں نے خیال آرائی کی۔ "شکریہ شکریہ"۔ میاں بیوی واقعی خوش ہو گئے۔ انھیں جانوروں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔

اس گھرانے سے میری ملاقات عرصہ قبل زولوجیکل گارڈن میں ہوئی تھی۔ جہاں میں ایک خوبصورت ہرن کو جنگلے سے ہاتھ بڑھا کر چیونگم کی آفر کر رہا تھا۔ یک لخت پیچھے سے ہنسی کی آواز آئی۔ "حیرت ہے آپ کو آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ہرن کو چیونگم سے پرہیز ہے!" یہ مسٹر سلیمان بجلی والا تھے، جن کے فقرے اور جن کی اہلیہ کی ہنسی سے ہمارے تعارف کا آغاز ہوا۔ گو میں اس مسئلے پر اُن سے خاصی دیر تک الجھا رہا کہ جانور چیونگم کیوں نہیں چباتے؟ انھوں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ چڑیا گھر کے جانوروں کو بوریت سے بچنے کے لئے چیونگم کی عادت ڈال لینی چاہیئے۔ علیحدہ ہوتے وقت بجلی والا

صاحب نے خلوص سے اپنا کارڈ عنایت کرتے ہوئے گھر مدعو کیا۔ اس وقت ہم ایک لکڑبگھے کے قریب الوداعی گفتگو میں مصروف تھے۔ لکڑبگھا بار بار اپنا سر جنگلے سے رگڑتا تھا جیسے بجلی والا صاحب کے گھر جانے کیلئے اصرار کر رہا ہو۔

سو اس واقعے کو کافی دن ہو گئے تھے اور اب میں فرصت نکال کر اُن کے گھر پہنچا تھا۔ خرگوشوں کے کمرے سے جانے کے بعد ہم اُن کے اور بچن پر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

مسز سلیمان کہنے لگیں۔ "گئے برس ہمارا ارادہ مگرمچھ خریدنے کا تھا، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ مگرمچھ کتنے مہنگے ہو چکے ہیں۔"

"بات یہ ہے مسز سلیمان!" میں نے کہا۔ "مگرمچھ خریدنا عیاشی ہے۔ شہر میں پانی کی شدید قلت ہے اور ایسے میں اگر ہمیں کوئی مگرمچھ مفت بھی دینا چاہے تو معذرت کر لینی چاہیئے۔"

"آپ کے خیال میں مگرمچھ کا متبادل کیا ہو سکتا ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دیکھئے مگرمچھ کا متبادل صرف مگرمچھ ہی ہو سکتا ہے، البتہ آپ مجھ سے مشورہ لینا چاہیں تو میں زرافہ خریدنے کی سفارش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"زرافے میں بھلا کیا خوبی ہے۔" مسز سلیمان کے میاں بولے۔

"اس کی گردن بے انتہا لمبی ہوتی ہے، آپ کا گھر ڈھونڈنے میں لوگوں کو دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"ہاں یہ تو ہے! لیکن ہمارے ہاں لوگ ہی کتنے آتے ہیں۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"زرافہ آجائے پھر لوگ بھی آنے لگیں گے۔"

"گڈ آئیڈیا" مسٹر سلیمان اچھل پڑے۔ پھر دونوں نے مل کر طے کیا کہ نئے سال کے بجٹ میں وہ ایک زرافے کے اخراجات کی بھی گنجائش نکالیں گے۔ یک بیک جیسے مسز سلیمان کو کچھ یاد آگیا ہو، وہ اپنے میاں کو مخاطب کر کے بولیں۔

"تم نے دیکھا! اس نے کیا حال بنا رکھا ہے۔؟"

"بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مجھ سے خود اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی رات بھر جاگتا، ٹہلتا اور چائے پیتا رہتا ہے۔ بھئی اس دور سے ہم بھی گزرے ہیں لیکن...."
"کل رات اچانک میری آنکھ کھل گئی، ایسا لگا جیسے کوئی رُوح ٹہل ٹہل کر بڑبڑا رہی ہو۔" مسز سلیمان بولیں۔
"اگر وہ شروع سال سے توجہ دیتا تو اتنی محنت کی ضرورت ہی کیا تھی!" اس موقع پر میں نے مسٹر سلیمان کو ٹوکا اور مداخلت کی۔
"سلیمان صاحب! میں آپ کی گفتگو کی تہہ تک اُترنے سے قاصر ہوں لیکن اگر میں غلطی نہیں کررہا تو شاید آپ یہ گفتگو اپنے پالتو اُودبلاؤ کے متعلق کررہے ہیں۔"
یہ سنتے ہی مسز سلیمان تلخی سے بولیں۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑرہا ہے کہ آپ کا اندازہ عبرتناک حد تک غلط نکلا" میں سکتے میں آگیا۔ چند لمحے بعد مسز سلیمان کے میاں نے انکشاف کیا کہ وہ یہ ذکر اپنے اکلوتے بیٹے پپّو کے متعلق کررہے ہیں جو ان دنوں میٹرک کا امتحان دے رہا ہے۔
میں نے درخواست کی کہ وہ اُسے بلائیں تاکہ میں اُسے چند نصیحتیں اور امتحان میں اچھے نمبر لانے کے آزمودہ گُر بتلادوں۔ چند لمحے میں ایک چڑھی چڑھی آنکھوں والا لڑکا جو کچھ ناراض اور غصے میں لگ رہا تھا۔ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسز سلیمان نے شفقت سے اس کی پُشت پر اسی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے، جس طرح انھوں نے گارڈن میں ہرن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تھا۔ کہا۔ "پپّو! یہ تمہارے انکل ہیں۔ یہ امتحان پاس کرنے میں تمہاری مدد کریں گے۔"
"ہیں۔ پپّو کی بتیسی باہر آگئی۔ "کیا آپ کی بورڈ آفس میں جان پہچان ہے؟"
"پپّو بیٹے! آپ اپنی محنت سے کامیابی حاصل کریں گے۔ میں تو آپ کو صرف چند ترکیبیں بتاؤں گا۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔
"جلد بتائیں، میرا کل انگریزی کا پرچہ ہے، مجھے ابھی کئی سوالات یاد کرنے ہیں۔"
وہ بیزاری بلکہ بدتمیزی سے بولا۔ تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا شاندار نمبروں سے

فیل ہو جائے گا۔ اس بات کو مسز سلیمان بجلی والا نے بھی محسوس کیا اور انھوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "پپّو! آرام! آرام سے بات کرو۔"

پھر میں نے اسے امتحان میں پاس ہونے کی چند ترکیبیں بتائیں، جسے سن کر وہ خوشی سے اُچھلنے لگا اور پھر اپنی ماں سے بولا۔

"ممّی! آپ انھیں تحفے میں خرگوش دے دیجئے نا!"

مسز سلیمان چپ رہیں، انہیں اپنے بچّے کی تجویز سے اتفاق نہ تھا۔

"کیا آپ ہمارے خرگوشوں میں دلچسپی لے رہے ہیں؟" مسٹر سلیمان نے گیند میرے کورٹ میں پھینک دی۔

"جی نہیں، شکریہ! میں خرگوشوں کو پسند نہیں کرتا۔" میں نے معذرت کے ساتھ گیند واپس کر دی۔ مسز بجلی والا نے شفقت سے مجھے دیکھا، اتنی شفقت سے انھوں نے کبھی اپنے بچے کو بھی نہ دیکھا ہوگا اور اگر دیکھا ہوتا تو اس کی کم از کم یہ حالت نہ ہوتی۔ دفعتاً میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"سلیمان صاحب! آپ کا طوطا کہیں دکھائی نہیں دے رہا!"

"یہ سامنے جو کھڑا ہے۔" انھوں نے پپّو کی طرف اشارہ کیا۔

مسز سلیمان جھٹ بولیں۔ "یہ آپ کے بیٹے کے بارے میں نہیں، طوطے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"چلو ایک ہی بات ہے" مسٹر سلیمان بوریت سے بولے۔

"ممّی اور ڈیڈی تو سارا وقت طوطا، مینا، اُود بلاؤ اور لکڑ بگھے میں لگے رہتے ہیں مجھے تو وقت ہی نہیں دیتے۔" پپّو نے رو کر گلہ کیا۔

"او مائی ڈارلنگ!" مسز سلیمان بجلی والا کی ممتا نے جوش مارا اور انھوں نے کھینچ کر پپّو کو اپنے سینے سے لگا لیا تب پپّو کی آنکھوں میں سکون اور طمانیت کا احساس جاگا۔ یہ احساس میں نے مسز بجلی والا کی گود میں دبکے ہوئے خرگوش کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کافی وقت گفتگو میں بہہ چکا تو میں نے اجازت چاہی۔ واپسی پر مجھے لگا کہ کسی زولوجیکل گارڈن سے لوٹ کر آیا ہوں جہاں سارے جانور مگن ہیں، سوائے ایک انسان کے بچّے کے۔

غریب کتّے

آوارہ کتّے افلاس کی اور گھریلو کتّے امارت کی نشانی ہوتے ہیں۔ بھونکتے دونوں ہیں لیکن گھریلو کتّے ایٹی کیٹ سے واقف ہوتے ہیں اور نفاست سے بھونکتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے، نفاست سے بھونکنا کیا ہوتا ہے؟ بڑا مشکل سوال ہے، اس کے لئے مجھے بھونک کر بتانا پڑے گا۔ شہرۂ آفاق مزاح نگار مارک ٹوئن نے کہیں لکھا ہے کہ شروع میں ہم لوگ اتنے غریب ہوتے تھے کہ رات کو چوروں سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں خود ہی بھونکنا بھی پڑتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بھونکنے کا یہی انداز شائستہ اور نفیس ہوتا ہے، اس میں انسانیت کی آواز شامل ہوتی ہے۔ ایسے کتّے جو کافی دنوں تک انسانوں کے قریب رہے ہوں، اور ان میں گھل مل گئے ہوں، ان میں انسانیت کی خوبو آجاتی ہے اور یوں ان کے بھونکنے کا اسٹائل آوارہ اور بیروزگار کتوں سے قدرے مختلف ہوجاتا ہے۔ ایسے کتوں کی ہمیں عزت کرنی چاہیئے۔ بڑے گھرانوں کے کتّے بھی بڑے ہوتے ہیں۔

ڈیفنس اور کے ڈی اے اسکیم نمبر ون کے بیشتر بنگلوں میں کتّے رکھ چھوڑے گئے ہیں۔ آپ بیل بجائیں تو اندر سے کسی کتّے کے زوردار طریقے سے بھونکنے کی آواز آئے گی بدقسمتی سے بہت سے لوگوں کو اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ گھنٹی کے جواب میں اس نوعیت کے ردعمل کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یقین جانیئے اس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ یہ اپر کلاس کے فیشن میں داخل ہے۔ بنگلے کے اندر سے کتّے کی بھونک جتنی بلند ہوگی، اسٹیٹس اتنا ہی بلند ہوگا۔ ویسے بھی آج کل اسٹیٹس کی چند ایک ہی تو نشانیاں باقی رہ

گئی ہیں۔ ایک بنگلہ، ایک ٹوٹا پھوٹا کرولا اور ایک خونخوار کتا! گئے برس ہم نے ایک بنگلے پر صاحبِ بنگلہ کو آواز دی تو اندر سے ایک متوقع جواب ملا، یعنی کتا بھونکا۔ دوسری اور تیسری بار بھی یہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ کھُلا اور صاحبِ خانہ نے میرا استقبال کرنے کے بعد معذرت کی کہ مجھ سے مل کر آپ کو یقیناً اندازہ ہوا ہوگا کہ تھوڑی دیر پہلے جو آواز آرہی تھی، وہ میری نہیں تھی۔ ہم نے خوش دلی سے ان کی معذرت قبول کی، خوشی بھی ہوئی کہ کُتا رکھنے کے باوجود ان کی حسِ مزاح متاثر نہیں ہوئی تھی۔

(۲، اپریل ۸۳ء)

کتا مقابلہ

ہمارے بزرگ کتے کو نجس جانور سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس جگہ کتے کا ایک رواں گر جائے۔ وہاں سے رحمت کے فرشتے نہیں گزرتے۔ انگلستان کے لارڈز نے ان تصورات کو بڑی زک پہنچائی اور انہوں نے جب انگلستان چھوڑا تو اپنے پیچھے ایک کالا انگریز اور دوسرا اس کا کتا چھوڑ گئے۔ دونوں ہی عوام پر بھونکتے ہیں۔ انگلستان میں آج بھی کتوں کی عزت ہوتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی اب ہمارے ہاں بھی ہونے لگی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض اعلیٰ گھرانوں میں جہاں بچے پیدا نہیں ہوتے۔ وہاں کتے پال لئے جاتے ہیں۔ اور اب تو یہ شوق اُن گھرانوں میں بھی مقبول ہو گیا ہے کہ جہاں بچوں کی پیدائش کوئی مسئلہ نہیں ہوتی۔

اخبار میں مقابلے کے انعام یافتہ کتوں کی ان کے مالکان اور تقریب کے مہمانِ خصوصی کے ساتھ ایک فوٹو بھی شائع ہوا ہے۔ تصویر میں کتے ٹرافیوں کے ساتھ یوں بیٹھے ہیں جیسے وہ بھی ایک قسم کی ٹرافی ہوں البتہ اس تصویر سے ہم یہ اندازہ نہیں لگا سکے ہیں کہ مقابلہ کتوں نے جیتا ہے یا اُن کے مالکان نے۔ اگر کتے جیتے ہیں تو پھر تصویر میں کتوں کو ٹرافی کے قریب بیٹھنے کے بجائے مہمانِ خصوصی کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیئے تھا اور اگر جیت مالکان کی ہوتی ہے تو پھر کتوں کے درمیان مقابلہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

بڑے لوگ پیدا کرنے کا طریقہ

فیض صاحب نے کہا ہے کہ بڑے لوگ فصل کی طرح نہیں ہوتے کہ بیج ڈالیں اور اگ آئیں۔ دنیا کے بڑے لوگوں کی پرورش بعض حالات میں ہوتی ہے اور بعض حالات ان کی پرورش کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔ فیض صاحب کے بیان کے برعکس اگر یوں ہوتا کہ بڑے لوگ فصل کی طرح ہوتے اور بیج ڈالتے ہی اُگ آتے تو قوم کو بڑی سہولتیں رہتیں۔ لوگ باگ بوقتِ ضرورت مقدار بھر قومی رہنماؤں کی کاشت کرتے اور ان سے اپنے مطلوبہ مسائل حل کرا لیتے۔ یہ بھی ہوتا کہ لوگ اپنی پسند اور ذوق کے مطابق بڑے لوگوں کی فصل اگاتے۔ کسی نے سیاستدانوں کا بیج ڈالا ہوا ہے تو کسی نے شاعروں کسی نے فن کاروں اور کسی نے فلسفیوں اور نجومیوں کی کاشت شروع کی ہوئی ہے۔ ایک پڑوسن دوسری سے پوچھتی ہے۔ "کیوں بہن! اس بار کیا ارادہ ہے؟" دوسری جواب دیتی ہے۔ "منے کے ابا کا اصرار تھا کہ برٹرنڈرسل اگاؤ۔ بیج تو ڈال دیا ہے، دیکھو تو کب اُگتا ہے۔"

اب ذرا تصور کیجئے! بازاروں میں بڑے لوگوں کے بیج تھوک کے بھاؤ فروخت ہو رہے ہیں۔ دکاندار گاہکوں کو بڑے لوگوں کے بیج پُڑیا میں باندھ باندھ کر دیتا جا رہا ہے اور آوازیں لگ رہی ہیں۔ "ہاں میاں! ایک بیج چارلی چپلن کا باندھ دینا۔" "چھوڑو یار! چارلی چپلن میں کیا رکھا ہے، کلے خریدو، محمد علی کلے کی قوم کو اس وقت بڑی ضرورت ہے۔" کوئی صاحب دانشور ہیں تو نطشے اور گوئٹے کے بیج خرید رہے ہیں۔ کسی نے سیاحت سے بھرپور طبیعت پائی ہے تو ابن بطوطہ اور واسکوڈی گاما کے بیج باندھے لئے جا رہا ہے

کسی کو حکمت سے لگاؤ ہے تو مٹھی میں حکیم جالینوس کا زیج دبائے تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف رواں ہے کسی کو پہلوانی سے شغف ہے تو وہ رستم و سہراب کے زیج مہنگے داموں خریدنے کیلئے تیار ہے۔ ایک دکان پہ اژدہام ٹوٹا پڑ رہا ہے۔ لیجئے وہاں مینا کماری، گریٹا گاربو اور برجی بارڈوت کے زیج بک رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ بلیک میں بک رہے ہیں کیونکہ حکومت نے ان پر پابندی لگادی ہے۔ دوست احباب آپس میں بیجوں کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ لوگوں نے کتابیں پڑھنی چھوڑ دیں کیونکہ جن فلسفیوں کی وہ کتابیں پڑھتے تھے، اُن سے اب براہِ راست استفادہ کر لیتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا طالب علم اپنے کلاس فیلو سے پوچھ رہا ہے۔ "بھئی، تمہارے پاس علامہ ابنِ جوزی کا زیج ہوگا۔ سوچ رہا ہوں ابھی سے زیج ڈال دوں گا تو امتحانات کے زمانے تک اُگ آئیں گے۔ تاریخ پر اُن سے گفتگو رہے گی۔ کچھ نکات ذہن میں اُلجھے ہوئے ہیں، صاف ہو جائیں گے۔ ہاں تم چاہو تو اس کے عوض مجھ سے ابنِ خلدون کا زیج لے لو۔" اور کلاس فیلو ناراض ہو کر جواب دیتا ہے۔ "میں تمہیں کوئی زیج و تیج نہیں دیتا۔ پچھلے سال تم مرزا غالب کا زیج لے گئے اور میرے کہنے کے باوجود تم نے مرزا سے ع اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں، والے شعر کی تشریح نہیں پوچھی، جس کی وجہ سے میری ڈویژن ماری گئی۔"

لیکن جیسا کہ فیض صاحب نے کہا ہے کہ بڑے لوگ فصل کی طرح نہیں ہوتے وہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی پیدائش کے لئے نرگس کو اپنی بے نوری پر ہزاروں سال تک پیچ و پچ کا رونا پڑتا ہے تب جا کے ایک دیدہ ور پیدا ہوتا ہے (اس دیدہ ور کو موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کی وجہ سے بعد میں چشمہ بھی لگ جاتا ہے) چونکہ ہمارے ہاں نرگس نے ہزاروں سال سے اپنی بے نوری پر رونا چھوڑ دیا ہے اس لئے دیدہ ور بھی پیدا نہیں ہو رہے جو نہایت افسوس کی بات ہے ہمیں چاہیئے کہ نرگس کو آبدیدہ ہونے پر مجبور کریں تاکہ دیدہ ور حضرات دوبارہ پیدا ہونے لگیں۔ ہمیں دیدہ وروں کی پیدائش کا کوئی دوسرا طریقہ بھی تو نہیں معلوم ہے۔

فیض صاحب نے اپنی تقریر میں بڑے لوگوں کی پیدائش کو حالات کے مشروط کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ بڑے لوگ کن حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات یا تو فیض صاحب بتا

سکتے ہیں یا ٹی وی کے مذاکروں میں حصّہ لینے والا کوئی دانشور ہی بتا سکے گا۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ بڑے لوگ کس قسم کے حالات میں چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے اطراف میں بڑوں کو کثرت سے چھوٹا اور چھوٹوں کو چشم زدن میں بڑا ہوتے دیکھا ہے۔ اس قسم کے مناظر کو دیکھ کر کسی شاعر نے بیتاب ہو کر کہا تھا۔

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو چھوٹے سے بڑے ہو گئے لیکن بڑا ہونا ایفورڈ نہ کر سکے اور پھر چھوٹے ہو گئے ان میں بالخصوص پی این اے کے عروج کے زمانے کے دو سیاستداں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو اپنی سیاسی غلطی کی وجہ سے پس منظر میں چلے گئے اور اتنے چھوٹے ہو گئے کہ اب دکھائی بھی نہیں دیتے۔ دوسرے کی عوام نے یکایک پذیرائی کی اور اتنی کہ خود موصوف کو یقین کرنے کے لئے اپنی چٹکی بھرنی پڑی لیکن جب وہ چٹکی بھر چکے تو حالات نے پلٹا کھالیا اور وہ دوبارہ اپنی پرانی قد و قامت پر لوٹ آئے۔

موجودہ دورِ حکومت میں بظاہر بڑے لوگ سرعت سے چھوٹے ہوئے ہیں اور متعدد چھوٹے اور گمنام لوگ لائم لائٹ میں آئے ہیں۔ جو لوگ چھوٹے ہوئے ہیں وہ تو بہت ممکن ہے چھوٹے ہی رہے ہوں لیکن جو لوگ وزارت اور مجلس شوریٰ کی سیڑھی کے ذریعے بڑے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں وقت ہی بتائے گا کہ ان کا اصل قد و قامت کیا تھا۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹائی بڑائی کے معیارات معیاری وقت کی طرح بین الاقوامی معیارات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ ہمارے اپنے معیارات و تصوّرات ہیں جن کا حقیقی عظمت و بڑائی سے ہم آہنگ ہونا لازمی نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اندر نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ بڑا، نہ عظیم نہ کمترین، وہ تو کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے جو اس کے قامت کو بلند کرتی ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کی بنا پر لوگ ایک دانشور کے مقابلے میں کسٹم کے چپراسی کی عزّت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جب ہمارے اردگرد بڑے لوگ پیدا ہونا بند ہوئے تو ہم اپنی ہر چیز کا مقابلہ ایسے

کی چیزوں سے کرنے لگ گئے۔ ایشیا کی بلند ترین عمارت، ایشیا کے عظیم ترین قائد، ایشیا کے عظیم ترین ہیئر ڈریسر، ایشیا کے مشہور منجم سبھی ہمارے ملک میں دستیاب تھے۔ ایک روز ہمارے ایک دوست نے یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ ایشیا میں سب سے زیادہ پتھر ڈرگ روڈ پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں چار و ناچار اس دعوے پر بھی یقین کرنا پڑا کہ ثبوت کے طور پر انھوں نے انہی پتھروں کے بارے میں مصطفیٰ زیدی کا ایک شعر بھی سنایا جس میں محبوبِ دلنواز کو یاددہانی کرائی گئی تھی کہ اگر اُسے تشریف لانا ہے تو انہی پتھروں پر چل کر آئے اس لئے کہ شاعر ایک اصول پسند ڈپٹی کمشنر ہے اور اس کے گھر کے راستے میں کہکشاں وغیرہ نہیں ہے۔ یہ شعر بھی ایشیا کا مقبول ترین شعر تھا۔ اِدھر جب سے ملک دو نیم ہوا ہے، ہم بھی اندر سے دو نیم ہو گئے ہیں اور ہم نے مارے حجاب کے اپنا مقابلہ ایشیا سے کرنا ترک کر دیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس مقابلے میں ہم دور تک چلے گئے تھے۔ اب ہمارے ہاں رنگ گورا کرنے والی ایک کریم کے سوا کوئی چیز بھی ایشیا کی انوکھی ترین چیز نہیں رہی۔

(۲۴ جنوری ۸۴ء)

سال کی آخری شام

نئے سال کی آمد کی خوشی میں بازار سے بہت سے غبارے خرید کر فضا میں چھوڑے گئے۔ غبارے ہوا میں اُوپر اور اُوپر اٹھتے گئے۔ یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ موٹے نے کہا۔

"آؤ چھولے کھاتے ہیں۔"

تین پلیٹ چھولے میں ایک میں نمک زیادہ، دوسری میں مرچیں زیادہ اور تیسری کو نمک اور مرچوں سے بالکل پاک رکھا گیا۔ جس پلیٹ میں نمک زیادہ تھا۔ اُسے کھایا نہ جا سکا، مرچوں والی پلیٹ کو تھامے ہوئے موٹے نے کئی چھینکیں ماریں، مگر سُوں سُوں کر کے چھولے کھاتا رہا۔ چھولے والا ہم تینوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں سے قلفی کی دکان پر آئے۔ دکان بند تھی۔ معلوم ہوا سردیوں میں دکان بند رہتی ہے۔ موٹے نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد چشمے والے سے پوچھا۔ "دکان کے دروازے پر ایک لات ماروں۔"

"نہیں نہیں گڑبڑ ہو جائے گی۔" چشمے والا ذرا ڈرپوک تھا، سہم گیا۔ پھر وہاں سے پیدل چل پڑے۔ کہاں؟ کس طرف؟ اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ردی کی ایک دکان پر پُرانے رسائل اور کتابیں پڑی تھیں۔ چشمے والے نے مشورہ دیا کہ سال بھر تو کچھ پڑھائی لکھائی ہوئی نہیں ہے کیوں نہ ایک رسالہ خرید لیا جائے۔ نئے سال میں اس کا مطالعہ کیا جائے گا۔ موٹے نے اس خیال کو ایک اچھا آئیڈیا قرار دیا۔ کئی رسائل کو الٹنے پلٹنے اور دیکھنے کے باوجود کوئی پسند نہیں آیا۔ ایک رسالے پر اعتراض تھا۔ تصویریں بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے میں صرف تحریریں تھیں، تصویریں بالکل غائب تھیں۔ تیسرے میں

میں تصویریں اور تحریریں مناسب مقدار میں موجود تھیں مگر ردی والے کا رویہ اچھا نہیں تھا۔

آدھ گھنٹے بعد اس نے ذرا تنک مزاجی سے مداخلت کی۔ "میاں کچھ لینا بھی ہے یا یونہی اٹکھیلیاں کرنے آئے ہو۔"

موٹے نے اکڑ کر جواب دیا۔ "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، قیمت بتاؤ۔"

"کس رسالے کی؟"

"رسالے کی نہیں پوری دکان کی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔

ٹیکسی والے سے پوچھا۔ "کلفٹن چلو گے۔"

کہنے لگا۔ "جائے گا مگر میٹر سے دو روپے زیادہ لگیں گا۔"

"ایسا کرو، میٹر سے دو روپے پہلے اتار دینا جتنا میٹر بنے اتنی رقم لے لینا۔"

چشمے والے نے سنجیدگی سے تجویز پیش کی۔ ٹیکسی والے کی کھوپڑی میں تجویز نہیں سما سکی۔ منہ بنا کر بولا۔ "اڑے جاؤ۔ مخولی مت کرو۔"

موٹا لفظ "مخولی" پر بہت ہنسا۔ ہم سے کہنے لگا۔ "چشمے والے کا نام آج سے "مخولی" رکھ دیتے ہیں۔ ہماری طرف سے اسے نئے سال کا تحفہ سمجھو۔ مخولی نے اس پر بہت شور مچایا اور احتجاجاً کہنے لگا۔ یہاں سے پیدل کلفٹن چلتے ہیں۔ سب نے اتفاق کیا۔ پیدل چلتے چلتے تھک گئے تو پیاس لگی۔ ایک بنگلے کے گیٹ کی بیل بجائی۔ اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ مخولی کتے سے بہت ڈرتا ہے، چیخ مار کر بھاگنے لگا۔ موٹے نے پکڑ لیا اور اسے سمجھایا۔ "ڈرو نہیں، یہ فیشن ہے، یورپ میں بھی بیل بجانے پر اندر سے ایسی ہی آواز آتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک خاتون برآمد ہوئیں کٹے ہوئے بال اور فیشن ایبل قسم کی۔ انگریزی میں کہنے لگیں :

"کیا بات ہے؟"

تینوں نے باری باری ایک دوسرے کا چہرہ تکا۔ خاتون نے اپنا سوال پھر دہرایا تو موٹے نے زور سے کہا۔

"آواز نہیں آ رہی"۔

خاتون قریب آئیں اور پھر پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ موٹے نے اشارے سے مخولی سے دریافت کیا کہ ترجمہ کر کے بتاؤ کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ مخولی نے ترجمہ کیا اور کہا کہ یہ پوچھ رہی ہیں کہ ہم سب کو پریشانی کیا ہے؟ ایک لمحے کیلئے ہم سب سوچ میں پڑ گئے کہ ہمیں آخر کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ پھر اچانک یاد آیا کہ ہمیں پیاس لگی ہے۔ پانی کا گلاس واپس کرتے ہوئے مخولی نے نہایت معصومیت سے پوچھا:

"کیا آپ کے کتے کو فرانسیسی آتی ہے"۔

پیدل چلتے چلتے ہم بہت تھک گئے تھے اور کلفٹن کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ سورج ڈوب جانے کا منظر ہمیں آج ہی دیکھنا تھا۔ ۸۱ء کا سورج جو آج ڈوب جائے گا۔ اس سال جتنی مسرتیں ملی تھیں، وہ تو ہوا میں گم ہو گئیں، کیا خبر آنے والا سال کیسا ہو؟ ایک پرانے ماڈل کی کار قریب سے گزری تو ہم نے لفٹ لینے کیلئے انگوٹھا دکھایا۔ کار انگوٹھے کے زور پر رُک گئی۔ مخولی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے یونہی بے خیالی میں دریافت کیا:

"سر! آپ کی یہ کار کتنے میں بک جائے گی؟"

"کیوں؟ آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟"

کار والے نے کچھ ناگواری سے مخولی کو گھورا۔ کار کی حالت واقعی خستہ تھی۔

"سر! آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں"۔

"تقریباً پچھتر ہزار روپے میں"۔ کار والے نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساڑھے سات عدد موٹر سائیکلیں!"

"کار کا موٹر سائیکل سے کیا تعلق؟"

"جناب اصل میں اس کے پاس موٹر سائیکل نہیں ہے، اس لئے ہر شے کی قیمت کا اندازہ موٹر سائیکل سے لگاتا ہے"۔ موٹے نے وضاحت جاری رکھی۔

"مثلاً حبیب بنک پلازہ کا مطلب ہوا کہ کئی کروڑ موٹر سائیکلیں اور ایک سائیکل کے معنی ہوئے کوئی بھی موٹر سائیکل نہیں، صرف پیدل۔

ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مخولی نے اداسی سے کہا۔" کیا سال واقعی بیت گیا۔؟"

" اور جو سال آنے والا ہے وہ بھی بیت جائے گا اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے"۔ موٹا پہلی بار سنجیدہ دکھائی دیا پھر وہ رُک کر کہنے لگا۔

" مخولی یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

" ہاتھ مل رہا ہوں"۔ مخولی کچھ بے چینی سے بولا۔" سال گزر گیا نا اب ہاتھ ملنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے"۔

۱۹۸۱ء کا سورج ڈوبتا جا رہا تھا اور سمندر کی چمکتی لہروں کی غمگین دمک ہمارے چہروں پر عیاں تھی۔ ہمارے دل اب تھک چکے تھے۔ ایک بے نام سے پچھتاوے کے ساتھ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا:" کیا سال واقعی بیت گیا؟"

(۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء)

بلّی کی جست

فرانز کافکا کی ایک کہانی میں ایک چوہا دنیا کے سُکڑ جانے پر شدید تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شروع شروع میں یہ دنیا اتنی بڑی تھی کہ مجھے خوف آتا تھا۔ میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا اور اب میں آخری کوٹھری میں آپہنچا ہوں۔ کوٹھری کے اس سِرے پر چوہے دان لگا ہوا ہے جس میں مجھ کو داخل ہونا ہی پڑے گا۔"

چوہے کی گفتگو سُن کر بلّی نے مداخلت کی:

"نہیں تم کو صرف رُخ بدلنا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اُسے کھا گئی۔

کافکا کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ دوڑتے وقت چوہے کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بالآخر اس کا واسطہ چوہے دان سے پڑے گا اور اسے چوہے دان اور بلّی کے پیٹ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ناگزیر ہوجائے گا۔ غالباً دنیا کے تمام چوہوں کا یہی مقدّر ہے۔

کافکا کی کہانی میں چوہے کے لئے نجات کی کوئی راہ نہیں بتائی گئی ہے۔ اس کہانی کا صرف ایک ہی مطلب ہے، چوہا جب تک چوہا ہے، اُسے کسی نہ کسی موڑ پر بلّی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ چوہے اور بلّی کا کھیل سدا سے جاری ہے۔ بہت سے چوہے مل کر بھی آج تک کسی تنہا بلّی کا مقابلہ نہیں کر سکے کیونکہ چوہے کے معنی ہیں بزدلی سے دوچار ہونا۔ چھوٹے دِل کا مالک ہونا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تیزی سے مِٹنے کے باوجود دنیا میں چوہوں کی

تعداد کم نہیں ہوئی۔ بہت ممکن ہے ان کی بقا میں بھی بلّی کی ڈپلومیسی کو دخل ہو بہت سے چوہے. بلّی کی مرضی سے بھی زندہ رہتے ہیں۔

بچپن میں ایک اور کہانی پڑھی تھی جس میں چوہے. بلّی کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں مگر. بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا فیصلہ کر لینے کے باوجود گھنٹی باندھنے کی جُرأت کسی میں نہیں ہوتی گویا محض اتحاد اور پھر اس اتحاد کے نتیجے میں کیا جانے والا فیصلہ ہی کافی نہیں بلکہ کامیابی کی شرط صرف اور صرف عمل پر منحصر ہے۔ گھنٹی باندھنے کا فیصلہ اور اور اس فیصلے پر عمل کے بیچ چوہوں کا دل حائل ہے جو بیحد چھوٹا، کمزور اور ڈرپوک ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں چوہوں کی عقل بھی ان کی جسامت سے بڑی نہیں ہوتی۔ وہ تو بس زمین کے اندر ہی اندر دور تک بِل بناتے چلے جاتے ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ چوہے زمین کے اندر ہی بِل کیوں بناتے ہیں۔ اس سوال کے بہت سے جواب ممکن ہیں۔ فی الحال اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہوگا کہ چوہے زمین کے اندر بِل محض بلّی کے خوف سے بناتے ہیں۔ بلّی بِل نہیں بنا سکتی اور نہ ہی ان تنگ و تاریک بِلوں میں داخل ہو سکتی ہے جہاں چوہے جانے کہاں کہاں سے چُرائی ہوئی چیزیں لاکر جمع رکھتے ہیں۔ چوہوں کی ان کارستانیوں کی وجہ سے انہیں کہیں سے بھی ہمدردی کے دو بول سننے کو نہیں ملتے۔ ظاہر ہے ایک تو ان کی حرکتیں اور پھر طاقتور بلّی کے مقابلے میں ان کی حمایت کی جرأت کون کرے۔!

ایک چوہے نے دوسرے سے کہا:

"یہ کتنا ظلم ہے کہ اتنی کثرت کے باوجود ہمارے مقدر میں چوہے دان ہی لکھا ہے"۔ دوسرے نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

"دنیا میں سُکھی کون ہے۔ ہمارے لئے بلّی ہے، بلّی کے لئے کتّا ہے۔ کتّے کے لئے آدمی ہے اور آدمی کیلئے دوسرا طاقتور آدمی ہے"۔

کافکا کی کہانی میں دُنیا چوہے کے بھاگنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی ہوتی، سکڑتی گئی۔ پہلے دائیں بائیں دیواریں دکھائی دیں۔ انھیں دیکھ کر چوہے کو تحفظ کا احساس

ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو خوامخواہ دنیا کی طوالت سے خوفزدہ ہوگیا تھا لیکن یہ لمبی دیواریں اتنی تیزی سے تنگ ہوئیں کہ سرکتے سرکتے ایک کوٹھڑی پر آکر ختم ہوگئیں اور جیسا کہ بتایا گیا کہ کوٹھڑی کے دوسرے سرے پر چوہے دان منہ کھولے اپنے مہمان کی آمد کا منتظر تھا۔ کیا دنیا واقعی چھوٹی ہوگئی تھی؟ یا یہ محض چوہے کا فریب تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا سے مُراد چوہے کی اپنی دنیا ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں چوہے کے اپنے مفاد، اپنے تحفظ کے خوف کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

کافکا کی کہانی کا چوہا اچانک، حیرت انگیز اور انتہائی بے رحمانہ طریقے سے بلّی کا نوالہ بن جاتا ہے اور قارئین کو چوہے کی موت کا ذرّہ برابر دکھ نہیں ہوتا۔ اسکرین پر صرف بلّی باقی رہ جاتی ہے۔ کافکا کی بلّی طاقتور ہے، اس لئے حق ہے۔ چوہا کمزور تھا، اس کا مرنا باجواز تھا۔

نسبتاً بے باک چوہے نے بیمار اور مرگھلی بلّی سے پوچھا۔

"اب تمہاری زندگی ختم ہونے کو آئی، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا تمہیں ان چوہوں کا کوئی افسوس نہیں جنھیں تم نے بے قصور کھالیا۔؟"

بلّی ہنسی اور پھر اس نے نہایت خوش اخلاقی سے اظہارِ تاسف کیا اور کہا۔ "واقعی آج تک چوہوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی مگر ایک راز کی بات ہے"۔

چوہے نے تجسس سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

بلّی نے ادھر ادُھر دیکھ کر کہا۔ "اگر وہ راز تم چوہوں کو پتہ چل جائے تو تم بلّی پر فتح حاصل کر سکتے ہو۔!"

بلّی کے رازدارانہ لہجے سے متاثر جستجو کا مارا چوہا اور نزدیک آگیا اور بے چینی سے بولا۔ "خدارا وہ راز مجھے جلدی بتاؤ!"

"وہ راز؟" بلّی نے یہ کہتے ہوئے جست لگا کر اُسے دبوچ لیا۔ "وہ راز یہ ہے کہ چوہا جب تک چوہا ہے۔ بلّی پر کبھی فتح نہیں پاسکتا۔"

اتنا کہہ کر بھوکی اور بیمار بلّی اُسے چٹ کر گئی۔

شاباش! طوطا زندہ باد

کراچی کے اکھاڑے میں چودہ پہلوانوں نے دھماچوکڑی مچا رکھی ہے۔ ریفری کی وسل بجتے ہی وہ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے نزدیک آتے ہیں۔ پھر چھلانگیں لگاتے ہیں، ٹنگیں رسید کرتے ہیں اور گھونسے مار مار کر اور باہیں مروڑ مروڑ کر ایک دوسرے کا حلیہ خراب کر دیتے ہیں، ان پہلوانوں کے نام سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تماشائیوں پر اپنی بہادری اور جواں مردی کی دھاک اپنی جسامت سے زیادہ اپنے ناموں کے ذریعے بٹھانا چاہتے ہیں۔ انہی میں ایک پہلوان پراسرار قاتل بھی شامل ہے جس کا اصلی نام اسامین بتایا جاتا ہے۔ اس پہلوان نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا ہے جس کی اب تک ایک ہی معقول توجیہ کی جا سکی ہے کہ وہ بہت خوفناک چہرے کا مالک ہے اور جس دن اکھاڑے میں وہ اپنے چہرے سے نقاب الٹ دے گا، سارے پہلوان تھر تھر کانپتے ہوئے اس کے قدموں پر گر پڑیں گے اور پراسرار قاتل ایک بھیانک قہقہہ لگائے گا اور دھواں بن کر غائب ہو جائے گا۔ پراسرار قاتل کے بارے میں ایک اور افواہ گرم ہے کہ وہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں بٹلر ہے اور پارٹ ٹائم میں پہلوانی کرتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ ایمپریس مارکیٹ پر مالشیہ ہے اور فارغ اوقات میں پہلوانوں کے پٹھے بٹھانے کا کام بھی کرتا ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ اس کا علم تو صرف پراسرار قاتل کو ہوگا یا پھر ناصر بھولو کو، جس نے اسے مار گرایا اور صحیح معنوں میں اپنے آپ کو بھولو کا جانشین ثابت کر دیا۔

انٹرنیشنل فری اسٹائل ریسلنگ میں چند ایک مقامی پہلوان بھی شریک ہیں، ان

میں چیمپئین فیصل آباد طوطا پہلوان کا نام نامی لائقِ تکریم و تعظیم ہے۔ جناب طوطا
پہلوان کے چہرے مہرے اور خدوخال کا بغور جائزہ لینے کے بعد بھی یہ سوال ہنوز ایک
سربستہ راز ہے کہ ان کا نام طوطا کیوں ہے؟ بہت غور و فکر کے بعد صرف اتنی سی بات
عقل میں آئی ہے کہ طوطا پہلوان کو طوطا کا لقب ان کے اُستاد نے اُس وقت دیا ہوگا
جب وہ اپنے استاد کے سکھائے ہوئے داؤ پیچ سے زیادہ اکھاڑے میں اُن کے لب و
لہجے اور گفتگو کی نقل اتارتے ہوں گے۔ اگر طوطا پہلوان اپنے اُستاد کے بتائے ہوئے
داؤ پیچ کی ہو بہو نقل کرتے تو آج دنیا انھیں "بندر پہلوان" کے نام سے پکارتی۔ سُنا
ہے اکھاڑے کے قریب پہلوانوں کے اُستاد اور دیگر گُرگے بھی بیٹھے رہتے ہیں اور
مقابلے کے دوران اپنے پہلوان کو مار کھاتا دیکھ کر چیخ چیخ کر باہر ہی سے داؤ پیچ
بتانا شروع کر دیتے ہیں اور الوکی سے مقابلے کے دوران تو اکرم پہلوان کی اخلاقی اور
جسمانی امداد کیلئے اس کے چھوٹے موٹے گرگے اکھاڑے کے اندر ہی گھس گئے تھے۔ اگر
اس ریسلنگ میں بھی ایسا موقع آیا تو طوطا پہلوان کے چت ہونے کی صورت میں اکھاڑے
کے باہر سے کچھ اس قسم کی حمایتی آوازیں آئیں گی۔" اوئے طوطے اُٹھ .... اوئے لگا زور
شاباش، طوطے ہاتھ مروڑ دے، اوئے لتاں رگا۔ شاباش۔ طوطا زندہ باد"۔

مقامی اخبار میں "انٹرنیشنل فری اسٹائل ریسلنگ" کا ایک دلچسپ اشتہار شائع ہوا ہے
جسے بعض ناقدین "انٹرنیشنل نورا اسٹائل ریسلنگ بھی قرار دے رہے ہیں۔ اشتہار کی
چنگھاڑتی ہوئی سُرخی ہے۔

"دنیا کے چوٹی کے ریسلرز کو دیکھنے کا آخری موقع"

ناقدین کا کہنا ہے اگر ریسلنگ حقیقی ہوتی اور پہلوان واقعتاً پہلوان ہوتے تو
سُرخی یوں ہونی چاہیئے تھی۔

"چوٹی کے ریسلرز کو دنیا دیکھنے کا آخری موقع"

اس اشتہار میں پہلوانوں کو "فخرِ پنجاب" "جرمنی کا بے رحم چیمپئن" "جزائر
ہوائی کا خوفناک چیمپئن" "بحرالکاہل کے جنگجو قبیلے کا سردار" کہہ کر تماشائیوں میں سنسنی

پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ "بے رحم چیمپئن" کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہوٹل میں قدم رکھنے سے پہلے خوب اچھی طرح سے چھان بین کر لی تھی کہ کمرے میں چھپکلی، کاکروچ اور چوہوں کی آمد و رفت تو نہیں رہتی۔ سنا ہے ہوٹل کا مینجر اس استفسار پر اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا تو "بے رحم چیمپئن" کے پرموٹر نے مینجر کو بتایا کہ بے رحم چیمپئن یہ استفسار ہوٹل کے وسیع تر مفاد میں کر رہے ہیں کیونکہ جزیرہ ہوائی کے ایک ہوٹل میں ایک چھپکلی دیکھ کر بے رحم چیمپئن نے ایسی دلدوز چیخ ماری تھی کہ ہوٹل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اس کا ہرجانہ ادا کرنے کے لئے بے رحم چیمپئن کو چھ مہینے تک مسلسل ریسلنگ میں حصہ لینا پڑا تھا۔ پرموٹر سے پوچھا گیا کہ بے رحم چیمپئن کی چھپکلیوں سے کیا مخاصمت ہے تو پرموٹر نے کندھے اچکا کر کہا کہ میں خاندانی جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔

مقابلے کے دوسرے روز کا نتیجہ اس لحاظ سے خوش کن تھا کہ ہمارا پہلوان، (فخرِ پاکستان) نے بحر الکاہل کے جنگجو قبیلے کے سردار سموآن جو کو تیسرے راؤنڈ میں دے مارا۔ جنگجو قبیلے کے سردار کی اس ہزیمت کو دیکھ کر تماشائیوں میں سے بہت سوں نے شدتِ غم سے آنکھیں موند لیں اور کہا کہ "سموآن جو تو واقعی بحر الکاہل ہے"۔ مقابلے کے بعد ہم نے معروف نقاد محمد علی صدیقی سے رابطہ قائم کیا اور "سموآن جو" کا مطلب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ بحر الکاہل کے بیشتر قبیلوں میں سموآن جو ایک محاورے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کا اردو ترجمہ ہے۔ "آ بیل مجھے مار"۔

ایک صاحب نے اشتہار پڑھ کر پوچھا کہ پہلوان سا برٹ ساتو کو دنیا میں دسویں نمبر پر بتایا گیا ہے لیکن یہ وضاحت نہیں ہے کہ رابرٹ ساتو آیا مار کھانے میں دسویں نمبر پر ہیں یا اکھاڑہ چھوڑ کر بھاگ نکلنے والوں میں ان کا مقام دسویں نمبر پر ہے۔

اس ریسلنگ کے ضمن میں عوام کو ٹیلیویژن حکام سے بہت سی شکایتیں ہیں سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ٹیلیویژن والوں نے وعدے اور اعلان کے باوجود ریسلنگ نہیں دکھائی۔ تحقیق کرنے پر انکشاف ہوا کہ مقابلے کو فلمانے کے لئے ٹی وی کے

کیمرے اسٹیڈیم پہنچا دیئے گئے تھے لیکن جونہی مقابلہ شروع ہوا اور کیمرہ آپریٹر نے کیمرے کی آنکھ سے مقابلے کو فلمانا شروع کیا، اُسے ہنسی آگئی۔ پہلے تو وہ ہنستا رہا مقابلہ دیکھتا اور پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستا رہا پھر قہقہے لگانے لگا۔ پوچھا کسی نے کہ بھائی ہنستے کیوں ہو؟ کیمرہ آپریٹر نے قہقہے کو روکتے ہوئے بمشکل کہا کہ "یہ جو کنگ کماٹا ہے نا، جزائر ہوائی کا خوفناک چیمپئن..... یہ ہوائی میں گوالا ہے اور دودھ بیچتا ہے"۔

پوچھا "تمہیں کیسے معلوم؟" کہنے لگا۔ "میری ہوائی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اس سے دودھ خرید کر پیا تھا۔" دوبارہ حیرت سے سوال کیا۔ "تم ہوائی میں کیوں اور کیسے گئے تھے؟ کیمرہ آپریٹر جھینپ کر بولا۔ "میں پچھلے سال ہوائی میں پاکستان کا خونخوار درندہ بن کر گیا تھا۔" (۲۰ مئی ۸۲ء)

مُفت کی تعلیم

یقین جانیں سرکاری اسکولوں کے بارے میں ہماری بھی رائے پہلے بہت بہتر تھی لیکن بُرا ہو اُس دن کا، جب ہمیں ایک اسکول جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکول کی صورتِ حال یہ تھی کہ جس کلاس روم میں ہم داخل ہوئے، اس کی کھڑکیاں اور دروازے غائب تھے اور دیواروں کے درمیان کھڑکی کی جگہ ایک شگاف سا تھا اور اس سے بھینسیں کلاس روم میں جھانک رہی تھیں کہ دوسری طرف بھینسوں کا باڑہ تھا۔ جب ہم ماسٹر صاحب کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ بلا مبالغہ ڈیڑھ دو سو بچے تنگ سے کمرے میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی تمام بچے میکینکی انداز میں چیخے۔ "السلام علیکم"

سلام کا جواب دینے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہم پر اپنے شاگردوں کی علمیت کا رعب ڈالنے کیلئے پوچھا "پیارے بچو! تمہیں کس نے پیدا کیا؟" بچے دھاڑے۔ "اللہ میاں نے"۔ "یہ زمین اور آسمان کس نے بنائے؟" بچے چیخے۔ "اللہ میاں نے"۔ اس سرکاری اسکول کی صرف ایک ہی خوبی تھی کہ اس میں عوام کے بچے مفت پڑھتے تھے اور ماسٹر صاحب کو تین ساڑھے تین سو روپے ماہانہ چیخ چیخ کر سوالات کرنے اور سبق یاد کرانے کے مل جاتے تھے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

(۲، اپریل ۸۲ء)

مسٹر بجٹ سے ایک مُلاقات

"خوش آمدید مسٹر بجٹ! آپ کیا لینا پسند کریں گے۔ ٹھنڈا یا گرم ؟"

"شکریہ! میں روزے سے ہوں"

"یہ آپ کے بازوؤں پر پٹّیاں کیسی بندھی ہوئی ہیں ؟"

"آپ سے ملنے آرہا تھا کہ لوگوں نے پہچان لیا۔ پہلے انھوں نے میرے خلاف جی کھول کر نعرے لگائے، پھر پتھراؤ کر دیا۔"

"مجھے بے حد افسوس ہے۔"

"ہر سال میرے ساتھ یہی ہوتا ہے، لہٰذا افسوس کرنا بیکار ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجھے کبھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہو۔ عوام نے مجھے دیکھ کر احتراماً ٹوپیاں اتاری ہوں یا دعائیں دی ہوں۔ گالیاں اور صرف گالیاں .... شاید یہی میری قسمت ہے۔"

"حوصلہ نہ ہاریئے مسٹر بجٹ، صبر کیجیے۔ عوام بھی صبر کرتے ہیں اور حوصلہ نہیں ہارتے۔ یہ بتایئے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ؟"

"بائیں بازو میں شدید تکلیف ہو رہی ہے .... اُف میرے خدا! میں تو بچ گیا ورنہ دو تین افراد تو موٹے موٹے ڈنڈے لئے چلے آ رہے تھے اگر میں ایک گھر میں گھس کر اپنی جان نہ بچاتا تو وہ مجھے موقع پر ہی ہلاک کر دیتے۔"

"اچھا تو یہ پٹّیاں وغیرہ اسی گھر میں بندھی ہیں، مہربان لوگ تھے وہ۔"

"جی نہیں، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اس گھر میں ایک عورت بیٹھی مہینے بھر کا حساب جوڑ رہی تھی، اُس نے نہایت عیاری سے مجھے ڈرائنگ رُوم میں بند کر دیا اور ایک خوفناک

قسم کی بید سے میری پٹائی لگائی۔ جب وہاں سے بھاگا تو چیخ کر کہنے لگی "سیدھے غلام اسحٰق خاں کے پاس جانا، سمجھے"۔

"بڑی ظالم عورت تھی وہ، کیا آپ نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی؟"

"جی ہاں، میں قریبی پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں ایک اے ایس آئی میز پر دونوں ٹانگیں چڑھائے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اپنی رام کہانی سنائی، وہ بیحد افسوس کرنے لگا اور پھر بولا۔ "آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ آپ لاک اپ میں تشریف رکھیئے، میں ابھی خاتون کو گرفتار کراتا ہوں۔ پھر اس نے مجھے لاک اپ میں بند کر دیا اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ مجھے اُلٹا لٹکا دیا جائے اور جتنی تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے، پہنچائی جائے۔ میں چلانے لگا تو سپاہی نے ڈانٹ دیا اور بولا۔ "جب تم آتے ہو تو ہم بھی اسی طرح چلا اٹھتے ہیں"۔

"گڈ گاڈ! یہ تو سراسر بہیمیت ہے"۔

"جی ہاں! تھانے سے جان چھڑانے میں مجھے کافی دیر لگ گئی لیکن اتنی دیر میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تھے۔ وہاں سے نکل کر میں نے ایک بنگلے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ برساتی میں تین چار کاریں کھڑی دیکھ کر مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ میری ضرور مدد کریں گے اور یہی ہوا۔ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میری خاطر تواضع کی۔ ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو بلوایا۔ جس نے میری مرہم پٹی کی۔ میں نے صاحبِ خانہ سے پوچھا۔ "آپ کا رویہ عوام کی بہ نسبت مجھ سے اتنا اچھا کیوں ہے۔ جواب ملا: "اس لئے کہ تم عوام کے نہیں ہو، ہمارے ہو"۔ "کیا آپ کو یہ جواب پسند آیا؟ آپ عوام میں سے نہ ہونے پر خوش ہیں۔؟"

"میں جب تک خواص میں تھا، خوش تھا، لیکن عوام میں آنے کے بعد میرے ساتھ نہایت تکلیف دہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ میں خان صاحب کے ایئر کنڈیشنڈ کشادہ اور آرام دہ کمرے کی میز پر رہا ہوں۔ کابینہ کے خوشگوار اور ٹھنڈے ماحول میں، میں موضوعِ گفتگو بنا ہوں، ۲۲ گریڈ کے افسروں کے درمیان مجھے ہمیشہ "واہ، واہ" کا شور سنائی دیا ہے، لیکن سب سے پہلے شرم شرم کی آواز اس وقت سنی، جب مجھے مجلس شوریٰ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اس موقع پر ایک خاتون نے بڑی دلچسپ بات کہی کہ آیا بجٹ کو شوریٰ کے سامنے

پیش کیا جا رہا ہے یا شوریٰ بجٹ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ فقرہ سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن خواجہ صفدر جو شوریٰ کے چیئرمین بننے کے بعد حسِ مزاح سے محروم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا "یہ سنجیدہ محفل ہے"۔ یہ سُن کر خاتون سنجیدہ ہو گئیں اور میں اس تحکمانہ جواب پر رنجیدہ۔!"

"مسٹر بجٹ! آپ پریشان نہ ہوں۔ لوگ شروع میں شور مچاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ عادی ہو جاتے ہیں، خان صاحب کے متعلق بھی اب لوگ کہتے ہیں کہ عوام کو چاہئیے کہ ان سے دوستی کر لیں، کیونکہ دریا میں رہ کر اُن سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔"

"آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ خان صاحب خوش کس طرح ہوتے ہیں۔؟"

"ہم آپ کی یعنی بجٹ کی بے پناہ تعریفیں کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ "یہ" بابو بجٹ نہیں" "بابے بجٹ" ہے۔ یہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ بجٹ نہیں بلکہ "بھوکا ننگا بجٹ" ہے۔ یہ بیوروکریسی کا نہیں، عوام کا بجٹ ہے۔ اس طرح خان صاحب خوش ہو جائیں گے، انہیں خوش اور راضی رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ جس سال عوام بجٹ کے خلاف جتنا زیادہ شوروغوغا کرتے ہیں۔ اس کے اگلے سال اتنا ہی ظالمانہ بجٹ آجاتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر بجٹ! کیا آپ مجھ سے متفق ہیں۔؟"

"میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گا کیونکہ مجھے عوام کے درمیان رہنا ہے۔ بعض افراد تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسا بجٹ لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ اتنے تنگ آجائیں کہ اچھے بجٹ کیلئے خود اٹھ کھڑے ہوں۔"

"مسٹر بجٹ! تمہیں وزیرِ خزانہ کے ہمراہ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہ کس نوعیت کے آدمی ہیں۔ ہم نے انہیں چند برسوں میں بہت تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ وہ شلوار کرتا زیبِ تن کرنے لگے ہیں۔ پریس کانفرنس اردو میں کرتے ہیں۔ اردو کلاسیکی غزل گو شعراء کے اشعار پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایسا تکلیف دہ بجٹ کیوں لاتے ہیں؟" "مجھے نہیں معلوم لیکن وزیرِ خزانہ اور عوام کے درمیان میں نے کوئی بہت زیادہ فرق تو محسوس نہیں کیا۔ سوائے اسکے کہ وزیرِ خزانہ میں اپنے دیس کی خوشبو نہیں ملتی۔ عوام کی خوشبو اُن سے دُور رہتی ہے اور اسی لئے بجٹ میں بھی وہ خوشبو نہیں آپاتی اور جونہی بجٹ آتا ہے وزیرِ خزانہ بگلا بھگت اور عوام بھگت سنگھ بن جاتے ہیں۔

ان کا اور ہمارا بچپن

انسانی بچپن میں بھی عجیب سحر پوشیدہ ہے۔ یہ سحر بڑی خاموشی سے اپنی جانب بلاتا ہے۔ حسین اور دلکش دنوں کے خواب دکھاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی ایسا طلسماتی دروازہ ہو جس کے ذریعے اپنے بچپن میں داخل ہو جائیں۔ پہلے کی طرح بچے بن جائیں۔ باغوں میں تتلیوں کا تعاقب کریں اور رنگین پروں سے اپنی کاپیاں بھر لیں۔ یہ کیسا جادو ہے کہ جب ہم بچے تھے تو اس نے کبھی ہمیں نہیں جگایا۔ تب تو یہ سوچتے تھے کہ جانے کب بڑے ہوں گے۔ ہمیں اپنے سے بڑوں کی زندگی پرکشش لگتی تھی۔ اُن کی آزادی اور اعتماد ہمیں اپنے بچپن سے بیزار کر دیتا تھا، لیکن جب دن گن گن بڑے ہوئے تو بچپن یاد آتا ہے۔ آزادی اور ذمہ داری گلے کا طوق اور پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ تتلیاں اب بھی اچھی لگتی ہیں مگر سادہ صفحات والی کاپیاں کھو گئی ہیں۔ باغات دور ہو گئے ہیں اور جن پر جھولتے تھے، وہ جھولے ٹوٹ گئے ہیں۔ معصومیت تتلی کا پیچھا کرتے ہوئے بچھڑ گئی اس کی کھوج میں نکلے تو چالاکی، دنیاداری اور مصلحت پسندی سے ملاقات ہو گئی، سب کچھ بھول گئے۔ اب بھی راہ چلتے گلیوں میں بھاگتے، ڈرائنگ روم میں کارٹون فلمیں دیکھتے اور اسکول جاتے، بچے ملتے ہیں مگر یہ وہ بچپن نہیں ہے، جن سے کبھی ہم ملے تھے۔

اس بچپن میں نوجوانی کی ذہانت اور بڑھاپے کی سی سنجیدگی ملتی ہے۔ ان کاپیوں میں تو باکسروں اور اداکاروں کی تصویریں ہوتی ہیں، ہمیں یاد ہے نوعمری میں ہماری سب سے زیادہ دوستی ضعیف دادی سے تھی جو ہمیں کہانیاں سناتی تھیں اور جن سے ہم بلا جھجک کوئی سوال بھی پوچھ لیتے تھے۔ ہمیں اپنی دادی اکثر چاند میں چرخا کاتتے بھی دکھائی دیں

اس لئے بیک وقت وہ ہماری محبت اور احترام کا مرکز تھیں۔ اب ہم نے دیکھا ہے کہ چاند اکیلا رہ گیا ہے اور اس میں بیٹھ کر چرخا کاتتی ہوئی دادی اپنے بچوں کی بے اعتنائی کی تاب نہ لاکر جانے کہاں چلی گئی ہیں۔ ہر چیز کی طرح اب بچے بھی بدل گئے ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں اپنا بچپن بھی یاد نہیں آتا کیونکہ یہ اچھے بچے نہیں، مدرسہ نہیں جاتے، پیدا ہونے کے بعد سیدھے اسکول چلے جاتے ہیں اور اسکول ہی میں ذہنی طور پر بلوغت کی منزل طے کر لیتے ہیں۔ ان کے اندر کی حیرت بہت جلد مر جاتی ہے اور یہ قبل از وقت سارے رازوں کو جان لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے چالاکی اور سمجھداری نے پیدائش کے بعد ہی ان کو اپنے قابو میں کر لیا تھا اور یوں معصومیت ہماری مجموعی زندگی سے رخصت ہو گئی۔

یہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ ہاں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ صنعتی شہر کی بے رحمی اور سنگینی سے بچاؤ کے لئے کون سا کام کیا گیا؟ ٹیلیویژن، نرسری، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، سینماؤں کے اشتہار، بسیں، میک اپ زدہ میس، ممی پاپا کے درمیان ہونے والی گفتگو، زندگی میں روپے کی قدر و قیمت، اسٹیکرز یہ سب کچھ کس تیزی سے اس بچپن میں داخل ہو گئے جہاں صرف چاند تھا، دادی تھیں، مسجد کے مولوی صاحب تھے۔ آم کے پیڑوں کے باغات تھے۔ پارعب ابا اور شفیق اماں بی کے علاوہ "منو نے ایک طوطا پالا" جیسی نظمیں تھیں جنھیں جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور یہ کبھی نہیں سوچتے تھے کہ "چونکہ منو کے ابا کسٹم میں ہیں، اس لئے یہ طوطا انہیں تحفے میں ملا ہوگا۔"

ہمیں پتہ تھا کہ منو کے ابا کہیں ہوں گے بھی تو ایک عام اور شریف آدمی ہوں گے اور چاہتے ہوں گے کہ منو طوطا پالنے کے علاوہ پڑھ لکھ کر ان کی ضعیفی کا آرام بن جائے مگر اب برسوں بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دن موقع پاکر منو کا طوطا پنجرے سے اڑ گیا۔ منو کو طوطے کے اڑ جانے کا کوئی دکھ نہیں ہوا کیونکہ گھر میں اب ٹیلیویژن آگیا تھا۔ ٹیلیویژن کے مقابلے میں طوطا بکواس تھا۔

منو کے ابا اب پہلے کی طرح پابندی سے شام کو گھر نہیں آتے تھے اور نہ ہی صبح تڑکے اس کا شانہ ہلا کر کہتے تھے۔ "اٹھو منو! اذان ہو گئی" اب سوتے وقت بھی ابا گھر پر

موجود نہیں ہوتے اور صبح کو وہ جا چکے ہوتے ہیں۔ منو اور آپا کا رشتہ پہلے جیسا نہیں رہا اور منّو کو اب گھر والے "مانی" کہہ کر بلاتے ہیں۔

انسانی بچپن میں بھی عجیب سحر پوشیدہ تھا مگر منّو کے بچپن سے وہ سحر، وہ جادو غائب ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ منّو جب بڑا ہوگا تو ہماری طرح اُسے اپنا بچپن نہیں ستائے گا۔ نہیں معلوم ہم میں اور منّو میں کون زیادہ خوش نصیب ہے۔؟

سفر آہستہ آہستہ

سہ پہر کا وقت تھا۔ بس کھچا کھچ بھری تھی۔

"سوسائٹی، کالا چھپرا، ڈرگ روڈ، ایئرپورٹ"۔ کنڈکٹر نعرے لگا رہا تھا۔ مسافر، بس چلنے کے انتظار میں مبتلا، بوریت کا شکار تھے۔ درمیانی نشست پر بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر شخص کھڑکی پر جھکا۔ پھر اس نے باآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

"قوم کی بہو بیٹیوں کو اشتہار کی زینت مت بناؤ"۔

"عریانی اور فحاشی، جرائم، زنا اور اغوا کا سبب ہیں"۔ طالب علم نے پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا، سامنے دیوار پر پوسٹرز لگے تھے۔

"یہ قوم کبھی سدھر کر نہیں دے گی، کبھی نہیں"۔ ادھیڑ عمر شخص نے پوسٹر کے مطالعے کے بعد بلیغ تبصرہ کیا۔ طالب علم کسما کر چپ ہو گیا۔ "کیا اس قسم کی مہم سے فحاشی اور عریانی ختم ہو جائے گی؟" اس نے سوال اٹھایا۔ "پتہ نہیں جناب"۔ طالب علم نے رائے پیش کرنے سے معذرت کر لی۔

"ارے توبہ کرو جی"۔ لال بوشرٹ پہنے ہوئے صاحب پچھلی سیٹ سے بولے۔ "جب تک رنچھوڑ لائن سے انڈین اور بلیو فلموں کے وڈیو کیسٹ سپلائی کئے جاتے رہیں گے، کچھ نہیں ہو سکتا"۔

"اچھا، تو کیسٹ رنچھوڑ لائن سے سپلائی ہوتے ہیں؟" بائیں جانب سے استعجابیہ آواز ابھری۔

"رنچھوڑ لائن میں تو کیسٹوں کا اڈہ ہے، ایسا ویسا"۔ انہیں صاحب نے صورتحال

کو نہایت ہولناک بنا کر پیش کیا۔

"تو کیا پولیس چھاپہ نہیں مارتی"۔

"پولیس.... ہا ہا ہا۔ کمال کر دیا، کیا پولیس والے وی سی آر نہیں دیکھتے۔ بھتے کی رقم الگ پہنچتی ہے اور نذرانے میں کیسٹ الگ دیئے جاتے ہیں!"

"میں تو کہتا ہوں، یہ قوم تباہ ہو جائے گی"۔ ادھیڑ عمر شخص نے پھر مایوسی کا اظہار کیا۔

"کیا وی سی آر دیکھنے سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں؟" طالب علم نے گردن کو جنبش دے کر نہایت معصومانہ لہجہ اختیار کیا۔

"جی ہاں ہو جاتی ہیں، بالکل تباہ ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہم ہو رہے ہیں"۔

"لیکن ہم کہاں سے تباہ ہو رہے ہیں۔؟"

"میاں صاحبزادے آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟" سفید بالوں والے بزرگ نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"ڈرگ کالونی میں رہتا ہوں جناب!"

"میرا مطلب ہے والد صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ والد صاحب سے جا کر پوچھئے"۔

"عجب بدتمیز لڑکا ہے"۔

فضا میں تلخی سی پیدا ہو گئی اور سب چپ ہو گئے۔ چند ہی لمحے بعد ادھیڑ عمر شخص سے رہا نہ گیا بے چین ہو کر کہنے لگے۔:

"ہماری تباہی کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو گی کہ ہم انڈیا سے ہار گئے"۔

"ہاں، بھلا بتایئے، ایک ہاکی رہ گئی تھی، سو اب اس میں بھی پٹ رہے ہیں"۔ کسی نے لقمہ دیا۔

"لیکن کھیل میں تو ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ ہم اگر کئی ٹیموں سے جیتتے ہیں تو ایک ٹیم سے ہار گئے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" طالب علم پُرجوش ہو گیا۔

"میاں صاحبزادے! تمہارے نزدیک تو کسی بات کی کچھ اہمیت ہی نہیں ہے، تمہیں

پتہ ہے انڈیا ہمارا دشمن ہے۔ اور تم تو پیدا ابھی نہیں ہوئے ہو گے جب پاکستان بنا ہم نے کتنی قربانیاں دی تھیں۔"

"ساری باتیں ٹھیک ہیں لیکن اس کا ہاکی میچ ہارنے سے کیا تعلق ہے۔"

"یعنی پاکستان، انڈیا سے ہار گیا اور کوئی بات ہی نہ ہوئی۔؟" لال شرٹ والے نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میرا خیال ہے اسپورٹسمین اسپرٹ ہونی چاہیئے۔" طالب علم نے کہا۔

"بیٹے! تم تو وی سی آر دیکھ دیکھ کر بھارت سے مرعوب ہو گئے ہو اور تمہارے ذہن پر انڈین اداکار، اداکارائیں اور کھلاڑی سوار ہیں۔"

"ہاں صاحب! وی سی آر نے نئی نسل کو تباہ کر دیا ہے۔"

"اسی لئے تو جماعت اسلامی والے مہم چلا رہے ہیں۔" ادھیڑ عمر شخص نے رسان کے کہا۔

"لیکن نعرے اور پوسٹر لگانے سے تو فحاشی اور عریانی ختم نہیں ہوتی.....!"

"تو پھر کیسے ہو گی؟"

"اس کے لئے ایک ایک شخص کو پکڑ کر سمجھانا ہو گا کہ میاں یہ ٹیپ ریکارڈ، یہ گندے گانے، یہ بھارتی فلمیں، یہ بلیو فلمیں، اسٹالوں پر ننگی تصویروں والے رسائل، ان سب کو غرقِ دریا کرو، ورنہ یہ تمہیں غرقِ دریا کر دیں گے۔"

"لیکن وی سی آر دیکھنے میں برائی کیا ہے۔" طالب علم کا اتنا کہنا تھا کہ ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔

کشادہ پیشانی والا بولا۔ "ہاں اور کیا؟ وی سی آر تو میں بھی دیکھتا ہوں، جب پاکستانی فلمیں دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تو انڈین فلمیں دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے اور پھر اب تو پاکستان اور انڈیا میں دوستی ہو رہی ہے۔"

"لیجئے ایک اور حمایتی پیدا ہو گئے۔" لال شرٹ والے نے مذاق اڑایا۔

"دو چار دس اور ایسے پیدا ہو جائیں تو قصہ تمام ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے تو جیسے فاتحہ ہی پڑھ لی۔

"جناب! اب زمانہ بدل چکا ہے۔ نیا دور ہے نئی روشنی ہے۔"
"ٹکٹ، ٹکٹ"۔ کنڈیکٹر چلاتا ہوا، بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا۔ اس نے طالب علم کا جملہ سن لیا، کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، یہ زمانہ اور ہے۔"

ادھیڑ عمر شخص نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ عمارتیں تیزی سے بھاگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور آسمان ایک عذاب کی طرح سر پر جھکا ہوا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی آسمان گر پڑے گا۔

(۱۲ جون ۸۲ء)

عمران خان کی اصل تصویر

قومی ٹیم (ہاکی + کرکٹ) غیر ملکی دورے سے اپنے سر پر اخبارات کیلئے گرما گرم چٹ پٹی خبروں کا ٹوکرا اٹھائے لوٹتی ہے۔ اس میں پہلی خبر ٹیم کے ہارنے یا جیتنے کی ہوتی ہے جو ٹیم کے واپس پہنچنے سے پہلے پہنچ جاتی ہے اور عوام خبر کی مناسبت سے ٹیم کے استقبال کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جبکہ بقیہ خبریں ٹیم کے پیچھے پیچھے پالتو بلیوں کی طرح چلی آتی ہیں۔ یہ خبریں کبھی کبھی تو ٹیم کے آگے آگے بھی ہوتی ہیں اور کبھی تو پوری ٹیم ہی ایسی خبروں کے جلو میں ہوتی ہے، تاہم ٹیم کے ارکان ان خبروں کو افواہوں سے تعبیر کرتے ہیں اور قومی اخبارات نہایت سادگی سے ان افواہوں کی تردید بھی چھاپ دیتے ہیں لیکن اس طرح سے کہ تردید کے نتیجے میں افواہ پر شبہ یقین میں بدل جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں ایک اخبار نے عمران خان کیخلاف برطانیہ کے اخبارات کے پروپیگنڈے کی مذمت کی اور وہاں شائع ہونے والی ایک تصویر کا حوالہ (دوبارہ چھاپ کر) دیتے ہوئے لکھا کہ اس تصویر میں رقاصہ کے ساتھ ناچنے والا شخص، عمران خان نہیں بلکہ کوئی اجنبی ہے اور یہ کہ شکست سے بوکھلا کر برطانوی اخبارات عمران خان کی کردار کشی کی مہم چلا رہے ہیں۔ اخبار نے ساتھ ہی عمران خان کی ایک دوسری تصویر بھی چھاپی اور لکھا کہ اصل تصویر یہ ہے جس میں عمران خان ایک برطانوی لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہیں جو اپنے لباس اور چہرے مہرے سے کسی رقاصہ سے کم دکھائی نہ دے رہی تھی۔

پہلے ہیئر ڈریسیر پھر انتخابات

برادرم اسلام سلمانی کا رسالہ "سنگھار" ہمیں ٹھیک اتنے ہی دنوں بعد ملتا ہے جتنے دنوں بعد ہم حجامت بنواتے ہیں، یعنی جتنی مدت میں ہم بال ترشواتے ہیں، اتنے عرصے میں اسلام سلمانی فنِ گیسو تراشی پر ایک عدد رسالہ مرتب کر لیتے ہیں۔ اس سے فیصلہ کر لیجئے کہ ہم اپنا کتنا وقت ضائع کرتے ہیں اور اسلام سلمانی اس وقت کو کیسے مجرب و مفید استعمال میں لاتے ہیں۔ جس طرح ہم کبھی کبھی بال ترشوانا بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی برادر اسلام سلمانی ہمیں اپنا رسالہ ارسال کرنا بھول جاتے ہیں۔ جب ہمیں "سنگھار" ملتا ہے تب ہمیں اپنے سر کا بوجھ ہلکا کرنے کا خیال آتا ہے اور "سنگھار" کے مطالعہ کے بعد تو سر پر سے رہا سہا بوجھ بھی اُتر جاتا ہے۔ یوں "سنگھار" اپنے قارئین کو سنگھار کی جانب مائل کرتا اور باربروں سے تعلق خاطر پیدا کرتا ہے۔ "سنگھار" میں کیا نہیں ہوتا؟ باربروں کے مسائل، تاریخِ انسانیت میں باربروں کا کردار، عظیم شخصیتوں کی فنِ گیسو آرائی سے دلچسپی، گیسوئے محبوب پر منتخب اشعار، اور پھر اخبارات میں شائع شدہ کالموں کا انتخاب جو برادر اسلام سلمانی اور ان کی برادری کے حوالے سے لکھے گئے۔ غرضیکہ "سنگھار" اپنے موضوعات اور مواد کے اعتبار سے ایک بھرپور رسالہ ہے۔ معیاری ادبی رسالہ کی کمیابی کے دور میں "سنگھار" کا دم بڑا غنیمت ہے کیونکہ ہمیں اس میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو ایک اچھے ادبی رسالے میں نایاب ہوتا ہے۔ ہاں! چند ایک ادبی رسائل "سنگھار" کی روش پر چل رہے ہیں اور وہ اپنے صفحات پر اپنے دوست ادیبوں کا ذکر اس محبت سے کرتے ہیں جس محبت سے اسلام سلمانی اپنے رسالے میں باربر برادری کا کرتے ہیں۔ رواں مہینے کے سنگھار میں دو مضامین نہایت

فکرانگیز اور معلوماتی ہیں۔ اس میں ایک مضمون تو ٹائیٹل پیج پر چھپا ہے جس کا عنوان ہے ! "جب ہوچی منہ ایک باربر شاپ سے ویت نامی انقلابی تحریک چلا رہے تھے"۔ اس مقالے میں انقلابی لیڈر ہوچی منہ کے باربروں سے خصوصی تعلق و محبت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں ہوچی منہ اور ایک ویت نامی باربر ہونگ فونگ کی دوستی کے واقعات قلمبند کیئے گئے ہیں۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ہوچی منہ ہونگ فونگ سے نہایت گہری محبت رکھتے تھے اور جب دن کے وقت ہونگ فونگ باربر شاپ میں ویت نامیوں کی حجامت بنانے جاتا تو ہوچی منہ گھریلو کاموں میں ہونگ فونگ کی بیوی تائی کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کے ساتھ چاول ابالتے اور ہوچی منہ کا ایک ساتھی بھونگ چی کیئن بازار سے سبزی لے کر آتا تھا۔ صرف یہی نہیں، ہوچی منہ اس باربر گھرانے سے اتنے قریب تھے کہ وہ ہونگ فونگ کے ننھے بیٹے ہائی کا بھی خیال رکھتے" اُسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتے دُھلاتے، رات کو اس کے کپڑے بدلتے اور اُسے نصیحتیں کرتے کہ " دیکھو ہائی ! تمہارا نام ہائی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم بڑے ہو کر صرف ہائی جیمپس لگایا کرو"۔ ان واقعات سے ہوچی منہ کے سگھڑپن پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی مسز تائی کی کام چوری اور نااہلی بھی واشگاف ہوتی ہے عجب نہیں کہ آئندہ مؤرخین ویت نام کے انقلاب میں تاخیر کی ذمہ داری مسز تائی اور ان کے بچے ہائی پر ڈالیں کہ جن کی خدمت گزاری میں ہوچی منہ کا قیمتی وقت ضائع ہوا۔ ہمیں خوشی ہے کہ برادر اسلام سلمانی نے ان واقعات سے ہوچی منہ کے باربر ہونگ فونگ کے ذاتی ملازم ہونے کا نتیجہ اخذ کرنے سے گریز کیا۔ ورنہ "سنگھار" کے ٹائیٹل پیج کی سُرخی "عظیم انقلابی ویت نامی رہنما ہوچی منہ ایک باربر کے خدمت گار تھے"۔ جیسی ہوتی اور ظاہر ہے اس سرخی پر آنجہانی ہوچی منہ اسلام سلمانی کا کیا بگاڑ لیتے۔ بہرکیف اس معاملے سے اتنا تو ثابت ہو ہی گیا کہ انقلاب بھی وہیں آتا ہے جہاں انقلابی شخصیات کو باربروں کا تعاون حاصل ہو۔

"سنگھار" میں اپنے اسلام سلمانی کا ایک عدد زوردار مضمون مطالبے کی صورت میں شامل اشاعت ہے جس میں انہوں نے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کے لئے ایک ماہر و معتبر

ہیئر ڈریسر کی تقرری کی ضرورت پر زور دیا ہے (مطالبے میں صدر کے مجوزہ ہیئر ڈریسر کیلئے "ماہر" ہونے کے ساتھ ساتھ "معتبر" ہونے کی شرط قابلِ غور ہے) مطالبہ میں حکومت کی توجہ اس حقیقت کی جانب دلائی گئی ہے کہ ایوانِ صدر میں مالی، بیرے، باورچی، دربان، خادم، اور خاکروب مستقل ملازم کی حیثیت سے رکھے گئے ہیں۔ ان حضرات کے ایوانِ صدر کی حدود میں یا اس کے قریب تر رہائشی کوارٹر بھی ہیں لیکن انتہائی حیرت انگیز امر ہے کہ ایوانِ صدر کے عملے میں ہنوز کسی ہیئر ڈریسر کا بطور سرکاری ملازم مستقل تقرر نہیں ہوا ہے بلکہ صدر صاحب کے گیسو تراشنے کیلئے عارضی طور پر کسی پسندیدہ ہیئر ڈریسر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اپنے فریضے کی انجام دہی اور اجرت کی وصولی کے بعد رخصت ہو جاتا ہے اسلام سلمانی صاحب کے بقول یہ بات صدرِ مملکت کی معزز ترین شخصیت کے شایانِ شان نہیں ہے بلکہ یہ عمل کئی اعتبار سے قومی وقار و عظمت اور تحفظ و تقدیس کے منافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس طریقۂ کار سے صدر مملکت کی ذاتی خدمت میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے اور پوری ہیئر ڈریسر برادری سے بھی انصاف نہیں کیا جا رہا ہے۔ نیز معزز فنِ گیسو آرائی کو بھی قومی اعزاز و سرکاری سرپرستی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

اسلام سلمانی نے اس ضمن میں مختلف ممالک کی مثالیں دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اُن کے سربراہانِ مملکت اپنے اپنے ذاتی ہیئر ڈریسر رکھتے ہیں جو ہمہ وقت اُن کا سَر مونڈنے کے لئے چوکس رہتے ہیں مثلاً امریکی وہائٹ ہاؤس میں ہیئر ڈریسر کا تقرر ہے بھارت کے راشٹر پتی بھون میں سرکاری ہیئر ڈریسر عرصہ دراز سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ برطانیہ کے بکنگھم پیلس اور ماسکو میں روسی صدر کی رہائش گاہ میں بھی ہیئر ڈریسروں کی مستقل اسامیاں موجود ہیں۔ دیگر بڑے بڑے ممالک میں بھی یہی طریقہ و اصول اپنایا گیا ہے۔ ان ممالک کے سربراہ جب بھی غیر ملکی دورے پر جاتے ہیں۔ ذاتی ہیئر ڈریسر اُن کے ہمراہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ امریکی صدر اور ملکہ برطانیہ کی پاکستان میں تشریف آوری کے موقع پر ہیئر ڈریسر اُن کے وفد میں شامل تھے۔ ان مسکت دلائل کے بعد آخر میں اسلام سلمانی صاحب نے صدرِ مملکت سے پُرزور اپیل کی ہے کہ وہ ان مثالوں کی روشنی میں اپنے لئے ایک

عدد ہیئر ڈریسر کی تقرری فرما کر ۵ لاکھ ہیئر ڈریسروں کی عزت افزائی فرمائیں۔

اسلام سلمانی صاحب نے اپنے مؤقف کی تائید کے لئے تحقیق و تفتیش میں اپنا خون جلایا ہے' ان کے پُر زور دلائل نے ہمیں متاثر کیا ہے اور ہم بھی ان کی آواز میں اپنی آواز ملاتے ہوئے صدرِ مملکت سے یہی مطالبہ کریں گے کہ وہ انتخابات کرائیں یا نہ کرائیں' اپنے لئے ایک ہیئر ڈریسر کی تقرری کی منظوری ضرور دے دیں۔

(۹ نومبر ۸۳ء)

باربر اور بادشاہ

شہرۂ آفاق باربر اور ابنِ انشاء مرحوم کی محبوب شخصیت جناب اسلام سلمانی نے معاشرے میں باربروں کو ان کا جائز مقام دلانے کی پیہم اور مسلسل جدوجہد کی ہے۔ ان کی کوششیں تاریخِ گیسو تراشی میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔ ان کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ اب حجام کو حجام کے بجائے باربر کہا جاتا ہے۔ خبر گرم ہے کہ اسلام سلمانی صاحب عنقریب باربر کو برادر کہنے کی تحریک چلانے والے ہیں۔ اس لئے کہ بہت سے لوگ بابر اور باربر میں فرق بھول جاتے ہیں اور یوں باربروں کا مغلوں سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ باربروں کی اعلیٰ کارکردگی مغلوں کے حصے میں اور مغلوں کی بداعمالیاں باربروں کے کھاتے میں آجاتی ہیں۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ باربروں نے رموزِ مملکت میں کبھی دخل نہیں دیا۔ ہمیشہ غیر سیاسی رہے اور خاموشی سے بادشاہ اور عوام کی حجامت کرتے رہے ممکن ہے باربروں کے اثرات بادشاہوں پر مرتب ہوئے ہوں اور انہوں نے عوام کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو باربر بادشاہ سے روا رکھتا تھا۔ تاریخ سے بادشاہوں کا وسیع پیمانے پر عوام کی حجامت بنانا ثابت ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہر عہد کے بادشاہ کو اس عہد کا عظیم باربر کہا جانا قطعی غلط نہ ہوگا۔ سو پیشۂ باربری کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیئے۔ کم لوگ یہ قصہ جانتے ہیں کہ ملک فارس کے غریب گھرانے میں دو جڑواں بیٹوں نے جنم لیا۔ ان میں سے ایک بادشاہ بن گیا' دوسرا باربر۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اکثریت اس واقعہ سے بے خبر ہونے کے باوجود لاشعوری طور پر دونوں کی عزت کرتی ہے اور دونوں کے حضور اپنا سر جھکا دیتی ہے۔

(۲۵ اپریل ۸۳ء)

لذیذ کانفرنس

طوطے نے تفکر آمیز لہجے میں کہا:

"طوطوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کی مارکیٹ ویلیو گر گئی۔ خدا رحم کرے"۔

کتے نے بات کاٹی۔ "اس کے برعکس ہمیں کوئی پوچھتا نہیں حالانکہ کافی عرصے سے ہماری تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔ کارپوریشن نے تو ہمارے خلاف باقاعدہ مہم شروع کی ہوئی ہے۔ کسی وقت بھی، کہیں بھی مارے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ آوارہ کتوں کا کسی بھی ترقی پذیر معاشرے میں بڑا اہم رول ہوتا ہے"۔

بندر نے اداسی سے اپنا مسئلہ چھیڑا:

شہر جب سے وجود میں آئے ہیں۔ ہماری آزادی کی زندگی تو بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہمیں مداری شہر میں لاتے ہیں۔ کھیل مذاق کر کے تماشائیوں کا جی بہلا کر پیسے بٹورتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی اور وہ بھی انسانوں کے لئے جینا، بڑا بے سود سا عمل لگتا ہے۔ کیوں میاں نیل کنٹھ۔؟"

نیل کنٹھ گہری سوچ میں گم تھا، کچھ نہیں بولا، البتہ گدھے نے ہنکار کر کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔

"بھئی سارے مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہماری طرح صبر و اطاعت کے خوگر بن جاؤ۔ کیا فائدہ" الٹے سیدھے خیالات کو ذہن میں پالنے سے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ دنیا کے سارے گدھے کتنے مطمئن رہتے ہیں، نہ کسی سے کوئی گلہ کرتے ہیں، نہ حرف شکایت زبان پر لاتے ہیں۔ مالک جتنا بوجھ لاد دیتا ہے، سہہ لیتے ہیں، جتنے چابک رسید کرتا ہے،

چپ چاپ کھا لیتے ہیں"۔
بلّی نے کتّے کو جھک کر آداب کیا اور کھڑکی سے سر نکال کر آنے کی اجازت چاہی اس کے اجازت چاہنے پر نیل کنٹھ خفا ہو گیا۔
"کیا تم نے اِسے انسانوں کی محفل سمجھ رکھا ہے جو حفظِ مراتب کا اتنا خیال رکھنے میں مگن ہو۔؟"
لومڑی نے پہلے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ:
"یوں تو آپ سب سے میرا رابطہ خاصا عرصہ پہلے کٹ چکا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ لوگوں کی صورتِ حال سے کبھی بے خبر نہیں رہی۔ بات یہ ہے کہ آپ سب کا تصوّرِ زندگی سرے سے ناقص ہے۔ تصوّرِ زندگی کی درستگی کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے"۔
"لومڑی تو پوری دانشور ہو گئی ہے"۔ گوریا نے کسی کے کان میں سرگوشی کی۔
"ہاں تو تصوّرِ زندگی یہ ہے کہ آپ زندگی کو کیا کوئی خوشگوار چیز سمجھتے ہیں؟ یا اُسے ایک جبری اور ناخوشگوار چیز۔ اگر زندگی خوشگوار چیز ہے تو پھر ناگواری کیسی اور اگر یہ ناگوار ہے تو پھر اسے خوشگوار بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ چالاکی سے جتنی خوشی، جس صورت سے بھی حاصل ہو سکے، حاصل کر لو، دولت، شہرت، اقتدار، حسن، اِن میں سے جو چیز بھی تمہیں پسند ہو، اُسے ہوشیاری سے جیت لو اور عام تاثر یہ دو جیسے تم جیتنے کے بجائے ہار گئے تا کہ تمہارے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکے"۔
"کتنی بے کار باتیں ہیں"۔ زرّافے نے اپنی لمبی گردن کو بیزاری سے جھٹکا۔
کوّا جو روشندان سے لومڑی کی باتیں بغور سن رہا تھا، کہنے لگا۔ "بھائیو! لومڑی کی باتوں میں نہ آنا۔ اس کی باتیں تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن یہ ہمیں ضرور کوئی نہ کوئی چکّر دے رہی ہے"۔
بطخ قائیں قائیں کرتے ہوئے یوں گویا ہوئی:

"سوچنے کی بات یہ ہے......"

"یہ آواز کہاں سے آرہی ہے"۔ اونٹ نے چیخ کر پوچھا۔

"آواز کہیں باہر سے نہیں آرہی ہے، بی بطخ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہیں بی بطخ آپ ذرا میز پر چڑھ جائیں۔ اجلاس کے بہت سے شرکا، کو آپ دکھائی نہیں دے رہی ہیں"۔

"کیا مصیبت ہے"۔ کہتے ہوئے بطخ نے اپنے پانی بھرے پروں کو جھٹکا اور اُڑ کر میز پر بیٹھ گئی۔ اس کی کامیاب لانگ جمپ پر سب نے تالیاں بجائیں۔

"ہاں تو بھئی سوچنا یہ ہے کہ آخر ہماری گفتگو کا ایجنڈا کیا ہے؟ ایجنڈے کے بغیر تو کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی۔ کم از کم میں نہیں کر سکتی"۔

بطخ کے نکتے پر کسی ایک نے دِل کھول کر داد دی اور اعلان کر دیا کہ بغیر ایجنڈے کے کانفرنس زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔

ایک لمحے کیلئے کانفرنس میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر کانفرنس کے صدر مسٹر چوہا نے اپنی دُم پر کھڑے ہو کر مختصر سی تقریر کی۔ انہوں نے کہا۔

"دوستو، بھائیو اور بہنو! مجھے خوشی ہے کہ ہماری بہن بطخ کے خیالات سے بہت سے جانوروں نے اتفاق کیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری آج کی کانفرنس ایجنڈے کے بغیر ہے اور ایسا جان بوجھ کر ہے۔ کیونکہ انسانوں نے آج تک ایجنڈا بنا کر جتنی کانفرنسیں اور اسمبلیاں کیں، آخر ان کا کون سا نتیجہ نکل آیا۔ (تالیاں) میں ذاتی طور پر ایجنڈے کو قطعی ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ آج صرف ایک موضوع پر اظہارِ خیال کیلئے ہم جمع ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم کس طرح اپنے بھائی بندوں کے فکری، لسانی اور نظریاتی اختلافات کو دور کر کے انہیں یکجہتی اور بھائی چارے کی لڑی میں پرو دیں اور کوئی ایسا قانون رائج کریں کہ طاقتور، کمزور پر ستم نہ ڈھا سکے"۔ اتنا کہہ کر چوہے نے بلّی کو کنکھیوں سے دیکھا بلّی ملاحت سے مسکرائی۔ اس نے کہا۔

"چوہے صاحب مثل میرے چھوٹے بھائی کے ہیں، میں اُن کے خیالات سے پورا

پورا اتفاق کرتی ہوں اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس پر پورا پورا عمل ہونا چاہیئے"۔
"کیا آپ صرف اُن کے خیالات سے اتفاق کرنے ہی پر اکتفا کریں گی"۔
لومڑی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"میں بھلا اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں"۔
"براہ کرم غیر ضروری مُباحث سے باز آجائیں، اصل موضوع پر گفتگو باقی ہے"۔
"لیکن اب تو رات بھی بہت ہو گئی ہے۔ میرے شوہر گھونسلے شریف میں واپس آتے ہی ہوں گے اور مجھے نہ پا کر خفا ہوں گے"۔ گوریا نے ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے اعتذار پیش کیا۔
"فکر کرنے کی ضرورت نہیں، آپ کو بلّی گھر تک چھوڑ آئے گی"۔ کسی نے مشورہ دیا اور بلّی نے بھی یہ فریضہ سر جھکا کر قبول کر لیا۔ پھر طے ہوا کہ آج کی کانفرنس میں اخوت اور بھائی چارے کا جو درس دیا جا رہا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ہر بڑا جانور اپنے سے چھوٹے جانور کو اس کے گھر تک چھوڑے گا اور اس کے مشکل وقت میں کام آئیگا۔
کانفرنس آدھی رات تک چلتی رہی اور تقریباً سب ہی ایک پُرامن فارمولے پر متفق ہو گئے اور انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے انسانوں سے اپیل کی کہ وہ بھی دنیا کے وسیع تر مفاد میں صلح و آشتی کر لیں اور باہمی اختلافات کو مٹا دیں۔ کانفرنس کے اختتام پر طے شدہ پروگرام اور پُرامن معاہدے کے تحت ہر چھوٹا اور کمزور جانور طاقتور اور مضبوط جانور کے ہمراہ روانہ ہو گیا لیکن اگلی صبح گوریا، طوطا، ہرن، بطخ، چوہا اور دیگر چھوٹے چھوٹے چرند پرند اپنے اپنے مسکنوں تک نہیں پہنچ سکے۔ بھیڑیئے نے ریچھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی رات کانفرنس خاصی کامیاب رہی، کیوں؟" ریچھ چٹخارے لیکر زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔
"بالکل بالکل، نہایت لذیذ کانفرنس تھی، آئندہ بھی اسے ہوتے رہنا چاہیئے"۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟

چند روز پیشتر ایک انگریزی اخبار نے ایک تصویر شائع کی جس میں کراچی کی ایک قدیم عمارت کو مسمار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ عمارت محض اس شکایت کی بنا پر منہدم کی گئی کہ پرانی ہو گئی تھی اور اتنی منافع بخش نہیں رہی تھی۔ عمارت کے مالک میں اگر ذرا سی بھی وضعداری ہوتی تو وہ اتنی معمولی سی شکایت پر اتنا بڑا ظلم ہرگز نہ ڈھاتا۔ اس لئے کہ عمارت پرانی ہو گئی تھی تو مالک بھی تو پرانا ہو گیا ہوگا' وہ کون سا نوزائیدہ ہوگا؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جب تک جیئے نوزائیدہ ہی رہے۔

مذکورہ عمارت کو اس خوش گمانی کی بنا پر ڈھایا گیا کہ اس کی جگہ نئی اور جدید عمارت تعمیر کی جائے گی۔ گویا جو عمارت آج جدید ہے وہ کل کلاں کو قدیم نہیں ہو سکتی اور جب عمارتوں کا مقدر قدیم ہونا ہی ٹھہرا تو پھر جدید عمارت کی تعمیر کا بہانہ بلا جواز ہے۔ صاف صاف کہنا چاہیئے کہ عمارت کو ڈھانا مقصود تھا' سو ڈھا دیا گیا۔ شاعر نے بھی تو یہی کہا تھا:

؎ کہ ہر تعمیر کو لازم ہے اک تخریب کی صورت

اصل میں جھگڑا نئے اور پرانے کا ہے۔ عمارت تو محض ایک آڑ ہے ورنہ زندگی کے ہر شعبے میں یہی ہو رہا ہے' نئے ڈیزائن کی پتلونیں بازار میں آتی ہیں تو پرانی متروک ہو جاتی ہیں۔ نئے بچے پیدا ہوتے ہیں تو پرانے بچے بوگس لگنے لگتے ہیں۔ زمانے کا یہی طریقہ اور یہی چلن ہے ورنہ بات صرف عمارتوں کی ہوتی تو اب بھی قدیم عمارتوں میں جو جاہ و جلال نظر آتا ہے اور جو عظمت ٹپکتی ہے۔ وہ جدید طرزِ تعمیر کی عمارتوں میں عنقا ہے۔

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن یا ہائیکورٹ کی عمارتیں دیکھئے
کیسی رعب و دبدبے والی ہیں، ان کے آگے کراچی کی بلند و بالا عمارتیں ماند ہیں اور ان کا
آپس میں موازنہ ایسا ہی ہے جیسے اپالو دیوتا کا موازنہ کسی فیشن ایبل چھوکرے سے کیا جائے۔
بات صرف اتنی سی ہے کہ عمارت محض اپنی بلندی سے حسین نہیں ہو جاتی، جیسے
کوئی آدمی محض درازقامتی کے سبب عقلمند نہیں کہلاتا۔ عمارتوں میں اور بھی پوشیدہ محاسن
ہوتے ہیں جو زائرین کی بصارت اور بصیرت پر خاموشی سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ فریئر ہال
کی عمارت پر ہی لمحے بھر کے لئے غور کیجئے۔ گوتھک طرزِ تعمیر کا کیسا متاثر کن نمونہ ہے۔ عمارت
کے سائے میں اتنی طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ ملگجی شام ہے،
درختوں کے جھنڈ میں چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ ہری ہری گھاس پر گول مٹول خوشحال بچے
لڑھکنیاں کھا رہے ہیں اور ان کی ممی دلکشی سے مسکرا رہی ہیں اور آپ اپنی جھگڑالو بیگم
تنک مزاج باس اور چھ عدد روتے منہ بسورتے بچوں کی فرمائشوں سے دور یہاں گوشۂ
عافیت میں بیٹھے گوتھک طرزِ تعمیر کے نمونے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں (زندگی کو تخلیقی
انداز میں بسر کرنے سے آدھا بوجھ تو سر سے ویسے ہی اتر جاتا ہے) برعکس اس کے جدید
طرز کے بنگلے، کوٹھیاں اور بلڈنگوں کے نزدیک جائیں تو آپ خود کو قدرے گھٹیا محسوس کریں
گے (اور ایسا غلط بھی کیا محسوس کریں گے) ذہن میں اس قسم کے واہیات خیال سر اٹھائیں
گے کہ ایسی ہی عمارت آپ کے پاس کیوں نہیں ہے؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اس بنگلے
کا مالک ہوتا؟ وغیرہ۔ ظاہر ہے ہائیکورٹ کی عمارت یا فریئر ہال کے سامنے اس قسم کے
خیالات کا پیدا ہونا محال ہے کیونکہ ان عمارتوں کی تعمیر کے وقت اس امر کا خصوصی
خیال رکھا گیا تھا کہ دیکھنے والے اسے دیکھ کر کم از کم فرسٹریشن کا شکار نہ ہوں۔ یہ بات
ہمیں ایک پرانے آرکیٹکٹ نے بتائی جو جدید عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر فرسٹریٹ ہوتا رہتا ہے۔
عمارتوں کی طرزِ تعمیر کا فرق دراصل تہذیبوں کے مزاج اور اقدار کا فرق ہے۔ یہ
عہد عمارتوں کا اور عمارت سازی کا ہے۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ عمارتیں اونچی سے اونچی اور
عمارتیں بنانے والے پست سے پست تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ

آج کل آدمی کی حیثیت اور مرتبہ بھی عمارت ہی سے متعین ہونے لگا ہے۔ آپ جتنی بڑی عمارت کے مالک ہوں گے، معاشرے میں اتنی ہی عزت کے مستحق قرار پائیں گے۔

عمارت تو خیر بڑی بات ہے، کچھ عرصہ قبل تک تو سگریٹ کے برانڈ سے بھی سماجی مرتبے کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ بعض دانا اس راز سے واقف ہوئے تو وہ چھوٹی برانڈ کا سگریٹ بڑی برانڈ کے پیکٹ میں رکھ کے پینے لگے۔ یہ دھوکہ بھی کچھ عرصے تک چلا لیکن روپے کی قیمت گری یا پتہ نہیں لوگوں کے پاس روپیہ زیادہ آ گیا کہ اب ہر دوسرا شخص دس بارہ روپے والے برانڈ کا سگریٹ پینے لگا ہے۔ سو اب سماجی حیثیت کا اندازہ سگریٹ کے برانڈ کے بجائے رہائشی علاقے سے لگایا جانے لگا ہے۔ شاندار عمارتوں والے علاقے میں رہنے کا مطلب ہے، شاندار سماجی حیثیت رکھنا۔ سو چھوٹے علاقوں کے رہنے والے باوقار محفلوں میں اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے شرماتے ہیں اور پوچھنے والے کو خوبصورتی سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیتے ہیں۔

عروس البلاد کراچی کے علاقے آمدنی کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے جزیروں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کے اعتبار سے اِن جزیروں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ شادی بیاہ، خوشی غمی، دکھ سکھ، رہن سہن، لین دین غرضیکہ وہ سارے معاملات جن کی بنا پر ہم سب کو ارسطو نے سماجی حیوان ٹھہرایا تھا، دائروں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک دائرے کا باسی دوسرے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اُن میں گھُل مل نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ دوسرے دائرے میں داخل ہونے کی شرائط پوری نہ کرے اور اس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ آپ اپنے دائرے میں قائم اپنے پُرانے گھر کو مسمار کر دیں اور دوسرے دائرے میں ایک جدید طرز کا بنگلہ تعمیر کریں۔

(۳۱ جنوری ۸۴ء)

خشک دُودھ اور امریکہ

امریکہ کا اپنا ایک الگ طریقۂ واردات ہے۔ اس کا احساس ہمیں بہت بعد میں جاکر ہوا۔ ورنہ بچپن میں ہماری عقیدت و محبت کے سارے جذبات امریکہ ہی سے وابستہ تھے۔ ہمارے ذہن میں امریکہ کا تصور ایک ملک کی حیثیت سے کم اور ایک حاجت روا، غیروں کے دکھ درد میں کام آنے والے ایثار پیشہ شخص کی حیثیت سے زیادہ تھا اور اس کے بڑے واضح اسباب موجود تھے۔ ہمیں اچھی طرح سے یاد ہے انہی دنوں اسکول میں طلبار کے درمیان خشک دودھ کی تھیلیاں اور گندم تقسیم کیا گیا تھا اور ساتھ ہی طلبار کو مطلع کیا گیا تھا کہ یہ ساری چیزیں امریکہ نے پاکستانی بچوں کے لئے بھجوائی ہیں۔ اسکول کے تقریباً سارے ہی بچے بیحد خوش تھے۔ وہ خشک دُودھ کا پاؤڈر پھانکتے جاتے اور امریکہ کی دریادلی اور فیاضی کے گُن گاتے جاتے تھے۔ بیشتر بچوں کی سوچ تھی کہ اگر راہ چلتے کہیں امریکہ سے ملاقات ہو جائے تو وہ اس سے ہاتھ ملا کر "تھینک یو" کہیں گے لیکن بد قسمتی سے امریکہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ایک دن ریلوے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے انجن کے نزدیک پہنچے تو اس پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا، جس پر دو ہاتھ مصافحہ کر رہے تھے۔ ان میں ایک پاکستان کا اور دُوسرا امریکہ کا ہاتھ تھا۔ "اچھا تو آجکل خوب گاڑھی چھن رہی ہے"۔ یہ سوچ کر ہم دل ہی دل میں مسکرائے اور کندھے اُچکاتے ہوئے آگے چل دیئے مگر امریکہ کا یہ سوچ کر ہمارے دل میں احترام اور بڑھ گیا کہ صرف خشک دودھ اور گندم ہی نہیں، امریکہ ہمیں انجن اور ریل کے ڈبے بھی فراہم کر رہا ہے، پھر امریکی صدر پاکستان آئے تو انہوں نے بشیر ساربان کو اپنا دوست

بنا لیا اور امریکہ آنے کی دعوت دی۔ ایک معمولی اونٹ والے کو امریکی صدر نے اتنی قدر و منزلت بخشی، اس کا تصور بھی عجیب حیرت انگیز تھا۔ امریکہ کیلئے اب مزید عزت و توقیر کے جذبات وابستہ کرنے کیلئے ہمارے پاس ایسے جذبات کی قلت درپیش آ گئی۔ اب تو یہی تھا کہ اگر امریکہ پر کبھی کوئی بُرا وقت پڑے تو ہم اس کی بقا کیلئے جان دیدیں لیکن امریکہ تو ہمارے خیال میں کوئی مافوق الفطرت شے بن گیا تھا جس پر کبھی کوئی مصیبت آ ہی نہیں سکتی۔ وہ تو دنیا کے نقشے پر ابھرا ہی اس لئے ہے کہ دوسروں کو مصائب سے نجات دلائے۔ کچھ اس قسم کے جذبات امریکہ سے وابستہ تھے لیکن ان جذبات کو پہلا زبردست جھٹکا لگا ۱۹۷۱ء میں۔ جب امریکہ کے وعدے اور شدید انتظار کے باوجود ساتواں بحری بیڑہ نہیں پہنچا۔ اس زمانے میں اچھے بھلے لوگوں کے چہروں پر اعتماد کا عجیب حال تھا۔ کوئی کہتا۔ "بھائی اب کیا ہو گا ڈھاکہ تو ہاتھ سے نکل گیا۔"

جواب ملتا :

"میاں دیکھتے جاؤ، ساتواں بحری بیڑہ پہنچنے والا ہے۔ بھارت کی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پتہ ہے بحری بیڑہ کیا ہوتا ہے۔؟"

"کیا ہوتا ہے ؟"

"پورا شہر ہوتا ہے، سمندر پر تیرتا ہوا، اس میں جہاز بھی ہوتے ہیں، فوجی بھی ہوتے ہیں، غرضیکہ سب کچھ ہوتا ہے۔"

دن پر دن گزرتے چلے گئے، بحری بیڑے کو نہ آنا تھا نہ آیا۔

وہی صاحب کہنے لگے :

"امریکہ کے بحری بیڑے نے تو ہمارا بیڑہ ہی غرق کر دیا۔"

"امریکہ اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ اب اس میں بھی فرق آ گیا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے، اب اس پر اعتبار کرنا خطرناک ہو گا۔"

تب ہی سے امریکہ کیخلاف چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ ہمارا ایمان بھی امریکہ پر سے متزلزل ہونے لگا۔ خشک دودھ، گندم اور نیا انجن کچھ عرصے تک تو مزاحمت کرتے رہے

لیکن کب تک؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ اور ہمارے نجی تعلقات (جو محض جذبۂ عقیدت تک محدود تھے) کے شیشے میں بال آتا گیا اور اب تو ہمارا اس کے علاوہ کوئی کام باقی نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اپنے فاضل اوقات میں دیگر فضول کاموں کے علاوہ امریکہ کو بُرا بھلا کہنے میں اپنا انتہائی قیمتی وقت صرف کرتے رہیں لیکن آج بھی یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اب بھی ایسے افراد کی تعداد اچھی خاصی ہے جو امریکہ کو حق بجانب تصور کرتے ہیں اور اس کی خامیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے امریکہ کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے افراد کو امریکی پٹھو کہہ دینے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ جس طرح کچھ لوگ روسی پٹھو ہیں، اسی طرح امریکی پٹھو بھی ممکن ہیں افسوس کہ ابھی تک بھارتی پٹھو، ایرانی پٹھو، انڈونیشی پٹھو، افریقی پٹھو، چینی اور جاپانی پٹھو، تیسری دنیا کی سیاست میں متعارف نہیں ہوئے ہیں۔ افسوس کہ تیسری دنیا کے سیاسی نظام پر امریکہ یا روس چھائے ہیں یا پھر ان کے پٹھو۔ ہمیں خوشی ہے کہ اب ہم کسی کے پٹھو نہیں ہیں۔ خیر بات امریکہ کی ہو رہی تھی اور ہم اس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ امریکہ کی قلعی کھل چکی ہے اور دنیا کے تمام مظلوم عوام جنھیں اب تک امریکہ خشک دودھ کی تھیلیاں دے دے کر بہلاتا رہا تھا، اب جاگ چکے ہیں۔ اب ان کے بچوں کو اگر بازار میں کہیں گھومتے پھرتے امریکہ مل جائے تو وہ اسے "تھینک یو" کہنے کے بجائے کہیں گے:

"آئی ہیٹ یو امریکہ"۔

ٹُلّا

یہ اتوار کی رات کا ذکر ہے۔

میں نے اپنے ایک دوست کو سوسائٹی میں اُس کے گھر پر ڈراپ کیا چونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس لئے میں نے دوست کے اصرار کے باوجود چائے کی پُرکشش آفر پر معذرت کرلی۔ طارق روڈ کے چوک پر خاکی اوورکوٹ پہنے ہوئے دو سپاہیوں نے رُکنے کا اشارہ کیا، چوک پر منظر بیحد دلچسپ تھا۔ نیلے رنگ کی ویسپا پر ایک صحتمند پولیس انسپکٹر آرام سے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے سیاہ چمکدار جیکٹ والے کئی لڑکے بے بسی سے کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کی موٹر سائیکلیں قریب ہی لگی تھیں۔ چوک پر تین چار ٹیکسی ڈرائیور اکڑوں بیٹھے تھے۔ اُن میں ایک ڈرائیور گنجا تھا اور اس کا گنج چاند کی روشنی میں کچھ اور چمک اٹھا تھا۔

"اوئے تم بھی لائن میں لگ جاؤ"۔ انسپکٹر نے مجھے حکم دیا۔

"لیکن میں ....."

"اوئے چپ کر کے لگ جاؤ لائن میں"۔ اس نے میری مزاحمت کو سختی سے جھٹک دیا

"ہاں تو آپ کیا کرتے ہو، بابو جی۔؟" انسپکٹر نے سب سے آگے کھڑے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

"پڑھتا ہوں"

"اچھا تو اسٹوڈنٹ ہو"

"جی ہاں"۔

"لائسنس ہے"؟
"اصل میں سر میں کچھ جلدی میں گھر سے نکلا تھا......" لڑکا کچھ گڑبڑا گیا۔
"ہاہاہا" انسپکٹر نے قہقہہ لگایا۔ "بہت دِنوں بعد پھنسے ہو"۔
"جی کیا مطلب!"
"ابھی مطلب سمجھ آجائے گی، گھبراؤ نہیں، اوئے گل محمد!"
"یس سر!" گل محمد نے ایڑیوں پر گھوم کر سیلوٹ مارا۔
"گل محمد، یہ اسٹوڈنٹ ہم لوگوں کو کیا کہہ کر بلاتے ہیں"۔
"سر! یہ ہم کو "ٹلے" "ٹلے" کہتے ہیں"۔
"اچھا تو تم ہمارے گل محمد کو "ٹلے" بولتے ہو، ایں؟"
"سر! میں نے کبھی نہیں کہا"، لڑکے نے نہایت لجاجت سے تردید کی۔
"تم نے نہیں کہا تو پھر کس نے کہا؟"
"مجھے نہیں پتہ سر"
"اوئے تم بکواس کرتے ہو۔ بتاؤ تم ہمیں ٹلا کیوں کہتے ہیں"۔ انسپکٹر کڑکا۔
"سر یقین مانیں، میں نے کبھی نہیں کہا"۔
"اچھا تو تم ہمیں کیا کہتے ہو؟"
"سر میں، میں تو کچھ بھی نہیں کہتا"۔
"تم کچھ بھی نہیں کہتے۔ اوئے تم جھوٹ بولتے ہو، ہم کو چکر دیتے ہو"۔
"سر قسم لے لیجئے"
"قسم، ہاہاہا۔ قسم کیا تم اپنے باپ کی کھاؤ گے۔!"
"سر باپ کو بیچ میں مت لائیے"۔
"اگر میں لے آیا تو تم کیا کر دگے۔؟" انسپکٹر غرایا۔
"سر جب میں نے ٹلا کہا نہیں تو پھر مجھ پر الزام کیوں رکھ رہے ہیں"۔
"اچھا تمہارے پاس لائسنس ہے"۔

"جی نہیں"۔

"کیوں نہیں ہے ۔؟"

"سر میں نے بتایا نا کہ جلدی میں نکلا تھا' اس لئے لائسنس رکھنا بھول گیا"۔

"یہ موٹر سائیکل تمہاری ہے۔!"

"یس سر"

"جب تمہارے پاس لائسنس نہیں ہے تو میں کیسے مان لوں کہ تمہاری ہے۔؟

"سر! میرے پاس گاڑی کے کاغذات ہیں"۔

"کاغذات نہیں چاہئیں، مجھے لائسنس دکھاؤ"۔

"لائسنس تو گھر پر ہے سر"۔

"پھر ضرور تم نے یہ موٹر سائیکل کہیں سے چرائی ہے۔ تم جیسے لونڈے بہت.... ....." انسپکٹر نے موٹی سی گالی دی۔

"صاحب جی ہم کب تک بیٹھے رہیں گے۔؟" گنجے نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بور ہو کر مداخلت کی۔

"یہ گنجا بہت بکواس کر رہا ہے، گل محمد اس کو ایک بٹ لگاؤ"۔ انسپکٹر نے بگڑ کر حکم دیا لیکن گل محمد اپنی جگہ پر خاموشی سے کھڑا رہا۔

"صاحب جی میں تو بولا ہی ایک گھنٹے کے بعد ہوں"۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے۔؟"

"اچھا جی نہیں بولتا"۔ گنجا سہم کر چپ ہو گیا۔

"ہاں تو پھر تم نے یہ گاڑی کدھر سے چرائی؟" انسپکٹر لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"سر! یہ میری اپنی ہے"۔

"ادئے تم کو میں اُلو کا پٹھا نظر آتا ہوں"۔

"نہیں سر"!

"اچھا تو تم اُلو کے پٹھے ہو؟"

"نہیں سر!"
"کیا کہا؟ تم نہیں ہو"۔ اس نے مضحکہ خیز حیرت سے پوچھا۔
"نہیں سر"؟
"گل محمد! یہ کیا ہے؟"
"سر! یہ اُلّو کا پٹھا ہے!" گل محمد نے سعادت مندی سے کہا۔
"ہاں بیٹے، تو تم کیا ہو؟"
"سر! میں الّو کا پٹھا ہوں"۔
"شاباش! ایک بار پھر کہو"۔
"سر میں..... الّو کا..... پٹھا..... ہوں"۔ لڑکے نے رک رک کر صاف لہجے میں اعتراف کیا۔
"اچھا بیٹے! تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟"
"بیس روپے"!
"صرف بیس روپے؟ اوئے تم دیکھنے میں تو کروڑپتی باپ کے بیٹے لگتے ہو"۔
لڑکا کچھ نہیں بولا، البتہ اس کا ساتھی پہلو بدلنے لگا۔
"اچھا، اب جلدی سے بیس روپے نکال دو"۔
لڑکا جس کی حالت ان مکالموں کے سبب غیر ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے جیب سے پرس نکال کر بیس روپے انسپکٹر کی طرف بڑھا دیئے جسے انسپکٹر نے بے نیازی سے پتلون کی جیب میں ٹھونس لئے۔
"اچھا! اب تم جا سکتے ہو؟"
"تھینک یو سر!"
"اوئے ٹھہرو!"
"جی؟" وہ ٹھٹھک گیا۔
"اب تم گل محمد کو ٹلّے تو نہیں بولو گے؟"

"کبھی نہیں سر۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم جلدی سے بھاگ جاؤ"۔ لڑکا موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"میرے لیئے کیا حکم ہے جناب"؟ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"آپ کیا کرتے ہیں جناب ؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

اس کے اس سوال کے جواب میں، میں نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ کارڈ دیکھ کر اس نے پہلے اُلٹا پلٹا، پھر غور سے پڑھنے لگا۔

"اچھا تو آپ پریس مین ہیں؟"

"جی ہاں! اتفاق سے۔؟"

"تو پھر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں"؟

"تو پھر کہاں کھڑا رہوں"؟

"آپ گھر جایئے جناب۔ اتنی دیر میں آپ لوگ گھر جاتے ہیں، اللہ اللہ، آپ لوگوں کی صحت خراب نہیں ہوتی۔ آپ فوراً جایئے جناب۔"

انسپکٹر ہمدردی اور محبت کے مارے رنجیدہ ہو گیا۔

"ٹلے، ٹلے"۔ دور سے آواز آئی، انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"اوئے تیری....." غصے سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"ٹلے ٹلے"۔ بیس روپے ادا کر کے تیز رفتاری سے موٹر سائیکل پر جاتا ہوا لڑکا چیخ رہا تھا۔ "ٹلے، ٹلے"۔

اور انسپکٹر اور گل محمد غصے میں پاگل ہو کر مغلظات بک رہے تھے۔

(۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء)

بغلول اور پیشگی سنسر

اخبارات پر سے پیشگی سنسر شپ کے خاتمے کا اعلان پڑھ کر میاں بغلول نے خوب بغلیں بجائیں، اخبار کو سینے سے لپٹا لیا، اُسے چوما، مسرت کے آنسو بہائے اور پھر ان گھوڑوں، گدھوں اور کتوں کے تعاون کا بہت بہت شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے اب تک اخبار کی خالی جگہیں پُر ہوتی رہیں اور مشکل حالات میں ان حیوانات نے اپنی تصاویر اُتارے جانے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میاں بغلول جوتے کی اس دکان پر بھی گئے اور مالک دکان کو گلے سے لگا کر اشک شوئی کی اور یاد دلایا کہ ایک بار جب اخبار کا اداریہ سنسر ہوگیا تھا تو اُن کا بڑا سا جوتا ہی کام آیا تھا کہ اداریے کی جگہ جوتے کی تصویر کو عوام میں بیحد سراہا گیا۔ حکومت کے پیشگی سنسر اٹھانے کی خوشی میں حاجی بغلول نے "غنوی ٹیلرز" پر جا کر اپنے لئے قراقلی ٹوپی تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ واپسی پر انہوں نے قینچیوں کی قیمتیں بھی دریافت کیں۔ معلوم ہوا کہ مارکیٹ سے قینچیاں عرصہ ہوا غائب ہو چکی ہیں تاہم دکاندار نے یقین دہانی کرائی کہ حکومت کے تازہ فیصلے سے قینچیوں کا وقار ایک بار پھر بحال ہو جائے گا اور جو قینچیاں اپنے بیجا استعمال پر شرما کر از خود مارکیٹ سے غائب ہو گئی تھیں۔ وہ جلد ہی اپنے پیروں پر چل کر واپس آجائیں گی۔ بغلول کو یہ بھی بتایا گیا کہ قینچیاں بنانے اور فروخت کرنے والوں کی انجمن نے فیصلہ کیا ہے کہ قینچیوں کے استعمال کے بارے میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا جائے گا۔ جن میں تصاویر کی مدد سے قینچی کے استعمال کا "صحیح طریقہ" اور "غلط طریقہ" بتایا جائے گا۔

دفتر واپسی پر راستے میں بغلول کو ایک انفارمیشن آفیسر بھی ملے اور کئی سال بعد وہ پہلی بار لپک کر نزدیک آئے اور "بغلول بھائی" کہہ کر گلے ملنے کی کوشش کی لیکن میاں بغلول نے انفارمیشن آفیسر کو اپنے بائیں ہاتھ کی مدد سے پیچھے ہٹا کر اُن کے گلے ملنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ میاں بغلول نے اُن سے کہا کہ دُور ہٹ کر بات کریں، زیادہ بے تکلفی اچھی بات نہیں ہے۔ انفارمیشن آفیسر نے تقریباً گلوگیر لہجے میں شکوہ کیا کہ "بغلول بھائی" کیا بات ہے، اِدھر چند روز سے ہمارے صحافی بھائیوں کا رویّہ ہی بدل گیا ہے، سب سے ہنس ہنس کر ملتے ہیں، ہمیں جھوٹے منہ بھی نہیں پوُچھتے۔"

بغلول نے انہیں جواب دیا کہ" راہ چلتے شکوہ کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں، پہلے ٹیلیفون پر وقت لیں پھر جو وقت دیا جائے، اس وقت پر آ کر اپنی شکایت بیان کریں، غور کیا جائے گا۔ شکایت معقول ہوئی تو ازالے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم اسے وعدہ نہیں، یقین دہانی تصوّر کریں"۔ یہ کہہ کر بغلول لپک کر بس نمبر آٹھ اے پر سوار ہو گئے۔

بغلول بیحد خوش تھے اور بس کی پچھلی نشست پر بیٹھے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر گنگنا رہے تھے کہ ساتھ والے مسافر نے اُن سے کہا۔

"براہِ کرم اپنی ٹانگ اور میری ٹانگ میں فرق محسوس کریں اور اپنی ٹانگ میری ٹانگ پر سے ہٹا لیں اور موسیقی کا اچھا ذوق پیدا کریں"۔

یہ سُن کر بغلول نے بغلیں بجانا بند کر کے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں۔ مسافر نے اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا کہ "کیا بات ہے آپ اتنے خوش کیوں ہیں۔؟"

بغلول نے بتایا کہ "خوش ہونے کی بات ہی ہے کہ حکومت نے اخبارات پر سے پیشگی سنسر ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے"۔

مسافر نے پوچھا۔" یہ پیشگی سنسر شپ کیا چیز ہوتی ہے؟"

وہ سنسر جو اخبار کے چھپنے سے پہلے ہوتا ہو، اُسے پیشگی سنسر شپ کہتے ہیں"۔ بغلول نے انھیں سمجھایا لیکن بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکی، پھر پوچھا۔

"تو کیا اخبار چھپنے کے بعد بھی سنسر ہو سکتا ہے؟"

"آپ مطلب نہیں سمجھے، مراد یہ ہے کہ پہلے اخبار کی کاپیاں چھپنے سے پہلے محکمۂ اطلاعات میں لے جائی جاتی تھیں۔ جہاں انفارمیشن آفیسرز، کلرک اور بعض اوقات باہر سے آئے ہوئے اُن کے دوست احباب بھی اِن کاپیوں کو چیک کرتے تھے اور ان میں جو قابلِ اعتراض مواد ہوتا تھا' اُسے قینچی کی مدد سے کاپی سے الگ کر کے اپنے پاس نوادرات کی طرح محفوظ کر لیتے تھے۔ اب یہ نہیں ہوگا بلکہ کاپیاں سیدھی پریس میں چلی جایا کریں گی"۔

"واہ! تو اب اخبار جلدی چھپ جایا کرے گا؟" مُسافر نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو حکومت کا بہت ہی اچھا فیصلہ ہے"۔ بغلول نے اپنا سمجھ کر مسافر کا سَر پیٹ لیا اور بتایا کہ "جی نہیں، اخبار اپنے سابقہ وقت پر ہی چھپے گا"۔

"اچھا تو پھر پیشگی سنسر اٹھانے سے فرق کیا پڑا؟" مسافر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"میرے بھائی بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے، مثلاً اب اخبارات کو پہلے کے مقابلے میں نسبتاً آزادی ملی ہے اور محکمۂ اطلاعات پر سے کام کا بوجھ بھی ہلکا ہوا ہے"۔

"اچھا تو حکومت نے دونوں ہی کو فائدہ پہنچا دیا ہے لیکن زیادہ فائدہ کس کو ہوا ہے۔؟" "قارئین کو!"

کیوں، کیا اب اخبارات کی قیمتیں گر جائیں گی؟"

"جی نہیں!" میاں بغلول نے جھنجھلا کر کہا۔ "قارئین پہلے بہت سی خبروں، اداریوں اور مضامین سے سنسر کی وجہ سے محروم رہتے تھے، اب وہ چھپیں گی اور قارئین انہیں پڑھ سکیں گے۔ اس طرح قارئین کو فائدہ پہنچے گا"۔

اس کا مطلب ہوا' اب اخبارات جو چاہیں چھاپیں یعنی وہ بالکل آزاد ہیں؟"

"بالکل آزاد تو نہیں کیونکہ اب سیلف سنسر کا قانون ہے"۔

"یہ سیلف سنسر شپ کیا ہوتی ہے؟"

یہ ایسی سنسر شپ ہے جو اخبارات خود اپنے آپ پر لاگو کریں گے۔

مثال سے سمجھاتا ہوں"۔ بغلول نے کہا "یوں سمجھئے کہ میں آپ کو احمق اور گاؤدی کہنا چاہتا ہوں لیکن مجھ پر سیلف سنسر شپ ہے۔ ایسی صورت میں، میں آپ کو احمق اور گاؤدی کہہ تو سکتا ہوں لیکن کہوں گا نہیں، کیونکہ مجھ پر سیلف سنسر شپ ہوگی"۔

"یعنی آپ کہیں گے تو نہیں لیکن دِل ہی دِل میں سمجھتے ضرور رہیں گے، کیوں؟" مسافر نے ناراض لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، بالکل"

"کیا کوئی ایسی سنسر شپ نافذ نہیں ہو سکتی جس کے تحت آپ اپنے دِل میں میرے بارے میں اس بیہودہ نوعیت کے اور واہیات خیال ہی نہ لا سکیں"۔

"بہت خوب، یہ ایک اچھا سوال کیا آپ نے"۔ بغلول نے کہا: "اس کیلئے آپ کو ایسی پالیسیوں سے گریز کرنا ہوگا جس کی وجہ سے آپ احمق یا گاؤدی محسوس کئے جائیں اور یہی بات آج تک کوئی حکومت نہیں سمجھ سکی"۔ اتنا کہہ کر بغلول بس سے اُتر گئے۔

دی فیکٹ

خبر گرم ہے کہ جتوئی صاحب "دی فیکٹ" کے عنوان سے جو کتاب تصنیف کر رہے ہیں، اس میں وہ ان افراد کے چہروں پر سے نقاب اتاریں گے، جنھوں نے بھٹو دور میں مراعات حاصل کی تھیں اور اب موجودہ حکومت میں شامل ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ جو لوگ بھٹو حکومت کے ساتھ تھے، وہ اپنے نقاب اتار کر ہی موجودہ حکومت میں شامل ہوئے ہیں لہٰذا جنھوں نے اپنے نقاب خود اتار دیئے ہیں جتوئی صاحب سے ان کی نقاب کشائی کیسے ممکن ہوگی؟ یہ مشکل ہمارے ایک ماہرِ لسانیات دوست نے حل کی، انھوں نے بتایا کہ افریقہ کے بعض قبیلوں میں "پتلون" کو "نقاب" کہتے ہیں

(۷، فروری ۸۴ء)

یہ پچھلی سردیوں کی بات ہے

موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نہایت غیر محسوس انداز میں سردی کی شدت میں کمی آگئی ہے اور برفیلی ہوائیں اپنے تھپیڑوں کے ساتھ رخصت ہو چکی ہیں۔ راتیں چھوٹی اور دن طویل ہو رہے ہیں۔ چند ماہ میں دن اور زیادہ طویل ہو جائیں گے اور راتیں سکڑ کر بہت چھوٹی ہو جائیں گی، ابھی ملا جلا موسم ہے۔ دوپہر میں تھوڑی بہت گرمی کی وجہ سے سوئٹر، کوٹ اور جیکٹ میں الجھن سی محسوس ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی ہلکا پھلکا سا لباس پہن لیں لیکن شام آتے ہی ٹھنڈ لگنے لگتی ہے۔ ایسے موسم میں گرم کپڑوں کی فروخت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ گرمیوں کے بھرپور طریقے سے شروع ہوتے ہی سارے گرم کپڑے لحاف، کمبل، شال اور چادریں بڑے بڑے ٹرنکوں میں بند ہو جائیں گے۔ آئندہ سردیوں تک کے لئے۔ دیکھا جائے تو سردیوں کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ مزاج میں ایک خوشگوار سی تبدیلی آجاتی ہے اور طبیعت میں افسردگی سی رچ بس جاتی ہے۔ کسی دوپہر کو سبزے پر پھیلی ہوئی دھوپ میں کرسی پر بیٹھے ہیں تو دل کرتا ہے کہ بس بیٹھے رہیں، سوچتے رہیں، ادھر ادھر کی بھولی بھٹکی باتیں، یادیں، ایسی سوچ سے یوں تو کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں ہوتا لیکن بس اچھا لگتا ہے۔ ذہن پر طاری دھند میں ہر چیز مبہم لیکن بہت بامعنی نظر آتی ہے، سردیوں کے موسم میں یہی ایک خاص بات ہے، جن کی وجہ سے سردیاں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ اس موسم میں خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور اکثر تنہائیوں میں یاد آتے ہیں اور ہم دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر ان واقعات کو دہراتے ہیں اور اپنے واقعے کا آغاز یوں کرتے ہیں کہ "یہ پچھلی سردیوں کی بات ہے۔"

سردیاں رخصت ہو رہی ہیں اور ساتھ ہی دل کی اُداسیاں بھی۔
بہت سے لوگ اُداس ہونا نہیں جانتے۔ وہ پتہ نہیں کیوں اور کس طرح مسرور رہتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں اور بلند آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور رشک بھی آتا ہے۔

بھلا کوئی آدمی ہر وقت کیسے خوش رہ سکتا ہے؟

اداسی کا لُطف اٹھائے بغیر خوشی کی حدّت کیونکر محسوس کی جاسکتی ہے؟ اس کے برعکس کچھ لوگ عام طور پر خاموش، سنجیدہ اور چپ چاپ رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ غل غپاڑے کے ماحول میں بھی صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں شاید ہی کبھی فلک شگاف قہقہہ بلند کیا ہو یا کسی لطیفے یا مضحکہ خیز واقعے پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے ہوں، اُن کی زندگی جھیل کی پرسکون اور خاموش سطح کی طرح یکسانیت کا شکار رہتی ہے۔ ایسے افراد کے سکون اور اعتماد کو دیکھ کر بعض اوقات خوشی بھی ہوتی ہے اور یہ خواہش ابھرتی ہے کہ "کاش ہم بھی ایسے ہی ہوتے"۔

سردیاں اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ لحاف سینے تک تان کر انہیں پڑھتے رہو۔ مطالعے کا جتنا لطف سردیوں میں آتا ہے، شاید کسی اور موسم میں نہیں آتا۔ موسموں میں اگر سردی کا مقابلہ کسی موسم سے کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف برسات ہے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ سردیاں زیادہ اچھی ہوتی ہیں یا برسات؟ میرا ایک دوست اکثر دعا کرتا ہے کہ خوب سردیاں ہوں، پھر آسمان پر بادل امڈ امڈ کر آئیں اور موسلا دھار بارشیں شروع ہو جائیں۔ غریبوں کیلئے اس سے زیادہ بُرا اور امیروں کیلئے اس سے زیادہ اچھا موسم کوئی نہیں، البتہ اگر ایسا ہو تو ٹھنڈک سے بچنے کیلئے لحاف میں چھپ کر قرۃ العین حیدر کے اداس ناول پڑھتے رہیئے اور بھول جائیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ دریچے سے آنے والا سرد ہوا کا جھونکا، اور بارش کی چھینٹیں اور آپ، اور ایک روح پرور کتاب۔

ہمارے معاشرے یا ماحول میں ایسے افراد کی بھی کثرت ہے جن کا بیشتر وقت شکوہ کرنے میں گزر جاتا ہے۔ ماحول کا شکوہ، گھر والوں اور دفتر کے احباب کا شکوہ، انہیں

ہر چیز اپنے خلاف محسوس ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں :

"میں کیا کروں؟ میری کامیابیوں پر لوگ حسد کرتے ہیں۔ میری راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔"

ان کا چہرہ سراپا شکوہ بنا رہتا ہے۔ محرومیاں، مایوسیاں ان کے ذہن پر اس درجہ غالب رہتی ہیں کہ وہ مثبت انداز میں سوچ ہی نہیں سکتے۔

ایسے افراد سے اداسی ہمیشہ دور رہتی ہے۔ بیمار ذہن کا آدمی اداس نہیں ہوتا۔ وہ صرف مایوس ہوتا ہے۔ اداسی اور مایوسی کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ اداسی آدمی کو خوبصورت بنا دیتی ہے، اداس آدمی سازشیں نہیں کرتا۔ زیادتی اور ناانصافی کی راہ پر نہیں چلتا۔ اداسی آدمی کو نیک بناتی ہے اور اداس ہونے کیلئے آدمی کے اندر نیکی کے جوہر کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔

(۱۳ فروری ۸۲ء)

سفید پوش کی دوڑ

ریفری نے وسل کب بجائی؟ یہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ یاد ہے تو بس اتنا کہ وسل بجتے ہی ایک دوڑ شروع ہوئی: اچھا مکان، اچھی کار، رنگین ٹیلیویژن، ریفریجریٹر، اور بلند معیارِ زندگی کی طرف۔ اس دوڑ میں خرگوش کی رفتار دوڑنے والے رستے میں سوتے بغیر دوڑتے رہے اور جیت گئے جبکہ کچھوے کی سی چال چلنے والے ابھی تک رینگ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، اپنی منزل کب آئیگی؟

آئے گی بھی یا رستے ہی میں زندگی کا سفر تمام ہو جائے گا؟ پھر وہ مایوسی سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں۔ "دوڑ میں جیتنے کا انعام مجھے نہیں تو میرے بچوں کو ضرور ملے گا۔ دوڑ رکنے نہ پائے کہ ریفری کی وسل مسلسل بج رہی ہے اور جیتنے والے ہار پہنے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے ہیں۔

سفید پوش آدمی کی دوڑ کچھوے کی دوڑ ہے، وہ ہانپ رہا ہے، تھک چکا ہے، مگر دوڑنے سے باز نہیں آتا۔ وہ جانتا ہے مقابلے میں شریک ہو کر آگے نکل جانے والے اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ سفید پوش آدمی کا نوجوان لڑکا اپنے خوشحال دوستوں سے اپنے محلّے کا نام لیتے ہوئے ہچکچاتا ہے کہ کہیں اس کی سفید پوشی کا بھرم نہ کھل جائے۔ کہیں استوار ہوتے ہوئے دوستانہ تعلقات کے درمیان ایک حجاب آلود غیر مرئی دیوار نہ آ کھڑی ہو۔ کہیں جیب سے جھانکتا ہوا گولڈ لیف کا پیکٹ مضحکہ خیز نہ بن جائے۔!

متوسط طبقے کا آدمی اپنی پسماندہ بستیوں میں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں وسل بجنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ دوڑ شروع ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کہ

مجھے اس دوڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے تو دو وقت کی روٹی اور بس سکون چاہیئے۔
لیکن ایک دن اس کی بیوی جو برسہا برس سے گھڑے کا پانی خود بھی پیتی تھی، اپنے بچے کو آواز دیکر کہنے لگی :
"نکمے! ذرا پڑوس سے بھاگ کے ٹھنڈے پانی کی بوتل تو لے آ"۔
پھر بیوی نے رازدارانہ لہجے میں اُسے بتایا کہ :
"پڑوس میں ریفریجریٹر آگیا ہے۔ پڑوسن کا میاں کل ہی ریاض سے آیا ہے"۔
وہ چپ رہا۔ چند روز بعد اس نے محسوس کیا کہ بچے شام ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ پڑوس میں ٹیلیویژن دیکھنے جاتے ہیں۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔
بیوی نے اب ٹھنڈے پانی کی بوتل کے علاوہ مسالہ پیسنے والی مشین بھی پڑوس سے منگانی شروع کی اور ایک دن اس کے سامنے ہی پڑوسن کے بچے نے صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ مشین نہ منگایا کریں۔ زیادہ استعمال سے خراب ہو جاتی ہے۔
وہ خون کا گھونٹ پی گیا مگر بولا کچھ نہیں۔
ریفری کی سیٹی مسلسل بج رہی تھی۔
مسجد سے نماز پڑھ کر واپسی پر کسی نے اطلاع دی کہ پڑوسی گلشن اقبال منتقل ہو گئے ہیں اور پھر چند برسوں میں تو ایک ایک کر کے تقریباً سب ہی علاقہ چھوڑ کر چلے گئے اور اُن کی جگہ نسبتاً زیادہ غریب لوگ علاقے میں آ گئے۔
جلنے والے ریفری کی وسل پر میدان میں اُترے تھے اس نے پلاٹوں کی قرعہ اندازی میں حصہ لیا، پر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور قرضے کے لئے ہاؤس بلڈنگ سے رابطہ قائم کیا تو افسران نے ٹال دیا۔
متوسط طبقے کا آدمی محسوس کر رہا تھا کہ اب بیوی کے لہجے میں تلخی پیدا ہو چکی ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طنزیہ فقرے اچھالتی ہے۔ اپنے شوہر پر، جو اُسے گرمیوں میں ایک گلاس ٹھنڈا پانی نہیں پلا سکتا۔ اُسے مسالہ پیسنے والی مشین لا کر نہیں دے سکتا اور بڑا بچہ جو کامرس پڑھ رہا تھا، اسے کیلکولیٹر فراہم نہیں کر سکتا۔

وہ مہینے بھر کی تنخواہ ہاتھ میں تھامے اپنی بیوی کو جھنجھلاتا، بچوں کو سرِ شام غائب ہوتا، زندگی کے افق پر روشن مستقبل کو معدوم ہوتا دیکھتا رہا۔ اسٹاپ پر بسوں کا انتظار کرتا رہا اور تاخیر سے دفتر پہنچنے پر باس کی پھٹکار سنتا رہا۔

اور پھر ایک دن اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی دوڑوں گا۔"

پھر وہ بھی دوڑ میں شامل ہو گیا لیکن مقابلہ شروع ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ جیتنے کے امکانات بیحد کم رہ گئے تھے، اس پر مایوسی چھانے لگی لیکن جونہی وہ مایوس ہوا۔ عقب سے بیوی اور بچوں کی تالیاں پیٹنے کی اور چیخنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں جو اُسے پکار پکار کر مقابلے میں حصّہ لینے پر اکسا رہے تھے۔

"ہاں شاباش، بہت خوب، بہت اچھے، تیز اور تیز!"

اِن پُرجوش آوازوں سے اس کے جذبات اُبل پڑے۔ مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے اور وہ کچھوے کی طرح گھسٹتے گھسٹتے ایک دم خرگوش بن گیا۔ یہ دوڑ آج بھی جاری ہے۔

جنھوں نے اب تک مقابلے میں حصّہ نہیں لیا۔ وہ فکرمندی سے پوچھتے ہیں: "یہ دوڑ کب ختم ہوگی؟"

فی الحال اِس کا کوئی جواب ممکن نہیں ہے، سوائے اِس کے کہ دوڑتے دوڑتے جب سب تھک جائیں گے۔ نڈھال ہو کر گر جائیں گے۔

اور واپسی کا راستہ طویل ہو جائے گا تو دوڑ خود بخود ختم ہو جائے گی اور دوڑنے والوں کے ہاتھ تھکن کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

(۲۷، اگست ۱۹۸۷)

کسی ڈائری کے چند اوراق

پچھلے ہفتے ایک ردّی فروش سے ہم نے چند پرانی کتابیں سستے داموں خریدیں اسی ڈھیر میں ہمیں ایک نادر ڈائری بھی ملی، جس پر ڈائری نویس کا نام اور پتہ ندارد تھا۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی کالعدم سیاستداں کی ڈائری ہوگی۔ ذیل میں ہم اس ڈائری کے چند اوراق بطور نمونے کے درج کر رہے ہیں تاکہ جن صاحب کی بھی ڈائری ہو وہ اسے پہچان لیں اور ہم سے وصول کرلیں تاہم اس کیلئے ڈائری کے غیر مطبوعہ حصوں کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔

یکم جنوری ۱۹۸۲ء :

آج سال کا پہلا دن ہے۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہوئے پانچ سال ہو گئے۔ ہر نئے سال کی ابتدا پر میں سوچتا ہوں کہ مجھے مارشل لا کے خاتمے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے پھر سوچتا ہوں "کیا کرنا چاہیئے؟" تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں لیکن میں کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ سیاستداں ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی لاعلمی یا غلطی کا اعتراف زیب نہیں دیتا۔ اسی لئے میں احتیاطاً اپنے بیانات میں صرف حکومت سے مطالبہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کام ذرا سہل بھی ہے اور محفوظ بھی لیکن اب تو میں مطالبے کر کر کے تھک ۔

نوٹ : یہ کالم اس لئے اہم ہے کہ اس کی اشاعت پر مولانا شاہ احمد نورانی نے کالم نگار اور "جنگ" اخبار کیخلاف ایک پریس کانفرنس میں شدید احتجاج کیا جس کے بعد اس اخبار سے کالم نگار کی علیحدگی عمل میں آئی۔ ایک ہفتے بعد مولینا نے حکومت کو سخت لعن طعن کیا کہ اس نے اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔

گیا ہوں۔ خدا کی پناہ! میں گزشتہ دس برس سے صرف مطالبے ہی تو کر رہا ہوں بعض ساتھی کہتے ہیں کہ میرے مطالبات اور بیانات میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں میں تو بہر حال سنجیدگی سے بیان دیتا ہوں۔ نئے سال کیلئے میرے ذہن میں کئی پروگرام ہیں۔ ان کی ترجیحات حسب ذیل ہوں گی۔

۱۔ اس برس بھی پچھلے برسوں کی طرح بلا ناغہ روز اخباری بیان جاری کروں گا۔

۲۔ تیتر اور بٹیر کے ساتھ مرغابیوں اور جنگلی بطخوں کا بھی شکار کروں گا۔

۳۔ حکومت مذاکرات کیلئے بلائے گی تو چلا جاؤں گا، نہیں بلائیگی تو بھی چلا جاؤں گا۔

۴۔ سیاستدانوں میں معاصرانہ چشمک کو ہوا دوں گا، اس سے شخصیت اور پارٹی میں سیاسی جاذبیت بڑھتی ہے۔

۵۔ اس سال مطالعے پر خصوصی توجہ دوں گا، خصوصاً اخبارات میں شائع شدہ اپنے بیانات کے مطالعے پر۔

۸، فروری :

صبح سویرے ایک رپورٹر آ دھمکا۔ وہ مجھ سے انٹرویو کرنے کا خواہاں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دس پندرہ روز تک بے پناہ مصروف ہوں حالانکہ میں قطعی مصروف نہیں تھا۔ سیاست پر پابندی کے زمانے میں ایک سیاستداں کی بھلا کیا مصروفیت ہو سکتی ہے۔ رپورٹر گھاگ نہیں تھا، اس نے میری بات پر یقین کرلیا۔ اس نے جب بہت اصرار کیا (جیسا کہ میں چاہتا تھا) تو میں نے ردّ و کد کے بعد اُسے منگل کی شام کا وقت دے دیا۔ وہ ممنون ہوا حالانکہ سچی بات یہ تھی کہ اس کے انٹرویو لینے کی درخواست پر دل ہی دل میں جتنا میں اس کا ممنون ہوا تھا، وہ خود تو کیا ہوا ہوگا۔ منگل کو پانچ دن رہتے ہیں، یہ دن کیسے کٹیں گے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اتنا لمبا وقت دے کر میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارلی ہے۔

۹، فروری :

انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو۔ کل سے یہی ایک لفظ ذہن میں دل و دماغ میں گردش کر رہا ہے۔ اس لفظ پر مجھے کتنا پیار آرہا ہے، بتا نہیں سکتا۔ چلتے چلتے ایک بار پھر کہہ کر دیکھتا ہوں کہ کیسا لگتا ہے۔ انٹرویو۔ واقعی کیوٹ لفظ ہے۔

۱۳ فروری :

بالآخر منگل آ ہی گیا۔ رپورٹر نے ڈھائی گھنٹے کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ وقت مقررہ پر پہنچ گیا تھا۔ میں تو خیر تیار بیٹھا تھا لیکن اُسے دیکھتے ہی میں ایسا ظاہر کرنے لگا جیسے مجھے کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ اس نے پوچھا: "تو پھر گفتگو شروع کروں"۔

میں نے جواباً سوال کیا۔ "کیا یہ انٹرویو ملتوی نہیں ہو سکتا۔؟" (یہ کہتے ہوئے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، اگر وہ انٹرویو کے التوا پر آمادہ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا)

"لیکن جناب انٹرویو کیلئے وقت تو پہلے سے طے ہے"۔ رپورٹر نے کہا۔

"جی ہاں! وہ تو ٹھیک ہے" میں نے فرمایا۔ "اصل میں مجھے پارٹی کی مجلس عاملہ کے ایک ہنگامی اجلاس کی صدارت کرنی ہے"۔ رپورٹر سخت بدمزہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں کھیل بگڑ نہ جائے خود ہی فرمایا۔ "اچھا چلئے! میں آپ کی خاطر اجلاس منسوخ کر دیتا ہوں۔ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے، میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہے"۔ میں نے انٹرکوم پر سیکرٹری کو ہدایت کی کہ وہ مجلس عاملہ کے ہنگامی اجلاس کو کل تک کیلئے ملتوی ہونے کی اطلاع اراکین تک پہنچا دے۔ سیکرٹری حیران ہوا، پوچھنے لگا: "کون سی مجلس عاملہ؟ کیسا اجلاس؟" لیکن جب میں نے اُسے ڈپٹ کر کہا کہ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی تعمیل کرے" تو وہ سمجھ آ گیا۔ آدمی ذہین ہے۔ رپورٹر نے انٹرویو کے دوران ایک نہایت بیوقوفانہ سوال کیا کہ آپ سیاست میں کیوں آئے؟ لگتا ہے ملک میں صحافت کا معیار بھی تیزی سے گر رہا ہے۔ خیر میں اس سوال کے جواب میں بیس منٹ تک بولتا رہا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ساری زندگی بولتا رہوں لیکن رپورٹر کی صحت اچھی نہیں تھی۔ پھر میرے سامنے وہ پہلے ہی سر درد کی دو گولیاں نگل چکا تھا۔ میں نے کہا کہ میں قوم کی خدمت کرنے، ایک آسودہ حال معاشرے کی تعمیر کرنے اور یہ کرنے اور وہ کرنے سیاست میں آیا ہوں۔ رپورٹر کے جانے کے بعد سے میں سوچ رہا ہوں کہ واقعی میں سیاست میں کیوں آیا؟ اگر مجھے بمبئی ٹاکیز میں چانس مل جاتا تو میں سیاست میں آتا ہی کیوں؟

(نوٹ: میں نے اس صفحے پر جا بجا "میں نے کہا" کے بجائے "میں نے فرمایا" لکھا ہے اس لئے کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ جو آدمی اپنی عزت خود نہیں کرتا، اس کی

دوسرے بھی عزت نہیں کرتے۔)

۶ ،مارچ :

گزشتہ چند روز کے اندر اندر میری کئی ہمعصر سیاستدانوں سے ملاقاتیں ہوئیں اُن میں شیر باز مزاری، مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر غفور احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نامعلوم کیوں دوسرے سیاستدان مجھ سے مل کر فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ میں بھی انہی جیسا ایک سیاستداں ہوں۔ شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر میں نے کالعدم جماعت اسلامی کی خوب غیبت کی، وہ بیحد خوش ہوئے اور گرم جوشی سے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ وہاں سے پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا، اتفاق سے مزاری صاحب موجود تھے۔ میں نے پروفیسر صاحب کے سامنے شاہ صاحب کے بارے میں چند فقرے اچھالے۔ مزاری صاحب کا چہرہ خوامخواہ سُرخ ہوگیا۔ بولے۔ "آپ جانتے ہیں کہ کوّا کوّے کا گوشت نہیں کھاتا۔ آپ کیسے سیاستداں ہیں کہ اپنے سیاستداں بھائی کی غیبت کر رہے ہیں"۔ میں نے بھی ناراض ہو کے فرمایا۔ "آپ نے سیاستدانوں کو کوّے سے تشبیہہ دے کے ہماری توہین کی ہے"۔ مزاری صاحب نے کہا۔ "میں نے تشبیہہ نہیں دی بلکہ موقع محل کی مناسبت سے ایک محاورہ استعمال کیا ہے اور ویسے بھی اُردو میری مادری زبان نہیں ہے"۔ معاملہ آگے بڑھ جاتا مگر خدا بھلا کرے پروفیسر صاحب کا انہوں نے بیچ میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا۔ میں نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ یہاں سے اٹھ کے سیدھا غلام احمد بلوّر اور عابد زبیری کے پاس جاؤں گا اور انہیں مزاری صاحب کیخلاف بھڑکاؤں گا۔ میں طبعاً مسلم لیگی ہوں۔

۱۰ ،مارچ :

آج میں بے حد اداس رہا۔ کسی اخبار میں بھی نہ میری کوئی خبر شائع ہوئی نہ ہی تصویر پارٹی کے سیکرٹری نشر و اشاعت بتاتے ہے مجھے کہ آج بازار میں اخبارات برائے نام فروخت ہوئے باقاعدہ خریداروں کے ہاں بھی مطالعۂ اخبار کا تناسب بیحد محدود رہا، خود میرا اپنا جی بھی اخبار پڑھنے کو نہ چاہا۔

۳ ،اپریل :

کل شب عجیب خواب دیکھا۔ سارا دن طبیعت پہ اس کا اثر باقی رہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ

لکھوکھا عوام میری تصویریں اٹھائے، میرے نام کے نعرے لگاتے ہوئے، سڑکیں، بازار، گلیاں گھروں کی چھتیں، درخت، کھمبے، ہر طرف انسانی سر ہی سر نظر آرہے ہیں۔ عجیب جوش و خروش کا عالم ہے۔ نعرے لگاتا ہوا ہجوم ایک سرکاری عمارت کے سامنے جا کے رکتا ہے۔ بالکنی سے میں مسکراتا ہوا نمودار ہوتا ہوں، وکٹری کا نشان دکھاتا ہوں، عوام زور دار طریقے سے تالیاں اور سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ پھر میں اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے خطاب کرتا ہوں: "میرے جیالے بھائیو! ......" مجھے کوئی زور سے جھنجھوڑتا ہے۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ بیگم کہہ رہی تھیں۔ آخر آپ کی نیند میں تقریریں کرنے کی عادت کب جائے گی۔؟"

(۱۲ر فروری ۸۴ء)

ریٹائرڈ جوتے

اتوار کی شام پچھلی گرمیوں میں خریدے گئے جوتے ریٹائر ہو گئے۔ بے دریغ استعمال سے ان کی ہیئت اس قدر بگڑ چکی تھی کہ پہچان میں نہ آتے تھے۔ سیلزمین نے جب انہیں ڈبے میں پیک کیا تھا تو یہ چمکیلے اور صحتمند تھے۔ انہیں پہن کر میں بہت دنوں تک چلتا رہا راہداری اور کمرے کے فرش پر، خوشنما گھاس اور پتھریلی سڑک پر، اسپتال اور سینما گھر کی سیڑھیوں پر، خوشگوار موسم میں آہستہ آہستہ قدموں سے اور عجلت میں دوڑتے ہوئے، پر انھوں نے کہیں دھوکہ نہ دیا اور کبھی انہیں گھسیٹ کر پیڑ کے نیچے سر جھکائے جوتے گانٹھتے موچی تک نہ لے جانا پڑا۔ کبھی یہ جوتے کتنے وفادار ثابت ہوتے ہیں۔ اتوار کی جس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ دورانِ مطالعہ یکایک میری نگاہ ان جوتوں پر چلی گئی۔ وہ صوفے کے نیچے تھکے تھکے سے انداز میں پڑے تھے شاید یہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔!

میں نے سنجیدگی سے سوچا۔ یہ ہم سب کا معمول ہے کہ گھر کو الوداع کہنے سے قبل برش سے اپنے جوتوں کو صاف کرتے، پالش سے چمکاتے اور پھر چل پڑتے ہیں لیکن سال دو سال میں ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب ان جوتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ انہیں اپنے آپ سے جدا کرنے کا فیصلہ، کیونکہ ان سے آرام حاصل کرنے کا لمحہ گزر چکا ہوتا ہے۔ میں نے جھک کر اپنے جوتوں کو صوفے کے نیچے سے اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر جائزہ لیا۔ "یہ واقعی کسی قابل نہیں رہے۔"

جوتوں کے سول گھس چکے تھے، اوپری حصہ پنجوں کے دباؤ سے مقررہ جگہ سے ہٹ کر پھیل چکا تھا اور بدنما لگتا تھا۔ پتلون کی موری اس بدنمائی کی پردہ پوشی نہ کرتی تو اُن کی عمر

کب کی ختم ہو چکی تھی۔ بہرکیف اب انہیں تبدیل ہو ہی جانا چاہیئے۔ تنخواہ ملنے میں کئی روز باقی تھے۔ نئے جوتے خریدنے کی خواہش نے آن گھیرا اور میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ اس کے لیئے مجھے کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے، جوتے ہر حال میں خریدنے ہیں۔

اتوار کی شام میں جوتوں کی دکان کے شوکیس کے پاس کھڑا، نئے ڈیزائن کے جوتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسٹینڈ پر نمونے کے جوتے سجے تھے۔ ان پر قیمتوں کی پرچیاں بھی چسپاں تھیں۔ جوتے تو بے انتہا مہنگے ہو چکے ہیں۔ ان سے تو ننگے پیر رہنا بہتر ہے۔ یہ دیہاتی سوچ تھی۔ شہر میں تو گداگر بھی جوتوں یا چپلوں کے بغیر گھومنا پسند نہیں کرتے۔ بھلا یہ کیسی عجیب بات تھی۔ نت نئے ڈیزائن کے جوتے فیشن میں شامل ہوئے لیکن برہنہ پا رہنا فیشن میں کبھی شامل نہ ہو سکا۔ جوتے تہذیب و شائستگی کی علامت بن چکے ہیں۔ بھاری جوتے تو طاقت کا استعارہ ہیں۔ کروڑوں انسانوں کی گردنیں ان قوی جوتوں تلے دبی رہتی ہیں۔ اتنی قوت سے کہ کراہ تک بلند نہیں ہوتی۔

مجھے دکان کے اندر داخل ہوتا پا کر سیلزمین بھاگتا ہوا آیا۔ "سر! آپ کے پیروں کا نمبر؟" کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"پیروں کے بھی کہیں نمبر ہوتے ہیں۔"

"معاف کیجئے، میرا مطلب ہے جوتوں کا نمبر!" سیلزمین جھینپ گیا۔ "موکیشن چاہیئے سر!" اس کے ادب و احترام سے بھرپور لہجے میں مسلسل "سَر" کہنے سے میرے نفس کو بڑی تقویت ملی۔ میں کرسی پر نیم دراز سا ہو گیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر جھلانے لگا۔ سیلزمین نے انداز شاہانہ کا قطعی بُرا نہ منایا۔ بھاگ کر اوپر تلے جوتوں کے کئی ڈبے اٹھا لایا۔

میں نے پُرانے جوتے اتار دیئے تھے۔ وہ میرے داہنے پیر میں جوتا پہنا رہا تھا۔ اس نے چمچے کی مدد سے تلوے کو جوتے میں اُتارنا چاہا۔ "بھئی زبردستی مت کرو۔" زور آزمائی پر میں نے ٹوکا۔ نو نمبر کے جوتوں کے ڈھیر لگے تھے لیکن یہ عمل نہایت پُرلطف تھا۔ ایک مجھ جیسا شخص جھک کر میرے پیروں کو چھو رہا تھا۔ جوتے پہنا رہا تھا اور میں پہنائے جانے والے جوتے میں کوئی نہ کوئی نقص دریافت کر کے اُسے رد کر دیتا تھا۔ دنیا میں جانے کہاں کہاں

کسی نہ کسی شکل میں یہ عمل جاری ہو گا"۔ سیلز مین نے ایک نیا ڈبّہ کھولا اور بظاہر خوش کن لہجے میں بولا۔"سر! یہ جوتے آپ کیلئے مناسب رہیں گے۔ مضبوط اور پائیدار ہیں"۔ دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں۔ آجکل فیشن میں بھی داخل ہیں!"

"یہ ڈیزائن براؤن میں نہیں ہے"۔ میں نے نیا نکتہ پیش کیا۔

"جی نہیں، یہ صرف بلیک میں ملے گا"۔

"مجھے بلیک شوز بالکل ناپسند ہیں"۔

"اچھا تو یہ دوسرا ڈیزائن دیکھ لیں، اس میں براؤن نکال دوں"

"نکال دو"۔ وہ بھاگ کر سیڑھی اٹھا لایا اور دیوار سے لگا، چھت پر چڑھ گیا۔ چند ہی ثانیے میں اُوپر سے دو تین ڈبے بھاری آواز میں فرش پر آ گرے۔ اب مجھے اس سارے کھیل سے اکتاہٹ ہو چکی تھی۔ "اِسے پیک کر دو"۔ میں نے ناپ دیکھنے کے بعد جوتوں کے ایک جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ سیلز مین ان جملوں کو سنتے ہی جیسے تازہ دم ہو گیا اور برق رفتاری سے جُوتوں کو ڈبّے میں پیک کرنے لگا۔ کچھ سوچ کر میں نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہرو اِسے پیک کرنے کی ضرورت نہیں، میں انہیں پہن کر جاؤں گا"۔ اس نے تعمیل کی، ڈبّہ دوبارہ کھُل گیا۔ میں نے پُرانے جوتوں پر خود غرضانہ نگاہ ڈالتے ہوئے نئے جوُتے پہن لئے۔ سیلز مین پرانے جوتوں کو ڈبّے میں رکھنے لگا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"کیا آپ اسے ساتھ نہیں لے جائیں گے"۔؟

"جی نہیں! اب اِسے کیا کرنا ہے"۔

"اچھا!" وہ خاموش ہو گیا۔ نئے جوتے پہنے اور بل ادا کرنے کے بعد میں دکان سے نکلا۔ ہاں باہر نکلتے وقت پلٹ کر اپنے ریٹائرڈ جوتوں کو دیکھنا نہ بھولا، جو میرے وجود سے علیحدہ فرش پر بیکار پڑے تھے۔

پہلی شرط

جناب پوپ پال نے ویٹیکن سٹی میں ۶۰ ہزار افراد سے خطاب کرتے ہوئے کیسی عجیب بات کہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی انسان، ملک یا حکومت، سچائی اور آزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جناب پوپ پال کا یہ بیان اتنا خوبصورت اور فکر انگیز تھا کہ اسے پڑھ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور پھر مجھے نیند آگئی۔

میں نے کہا۔ "آپ نہایت مقدس انسان دکھائی دیتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا آپ ہی پوپ پال ہیں"۔ انہوں نے فرمایا۔ "ہاں یہ میں ہی ہوں"۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ سچائی کیا ہے؟"

"سچائی آپ کے ضمیر کی آواز کا نام ہے"۔

"اور ضمیر کیا ہے؟"

"ایک سچائی جو آپ کے باطن میں موجود ہے"۔

"یعنی سچائی اور ضمیر ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں"۔

"ہاں سچائی کا چہرہ جب دھندلا جاتا ہے اور اس کی پہچان دشوار ہو جاتی ہے تو ہم اسے اپنے ضمیر کی آواز سے پہچانتے ہیں"۔

"کیا آج سچائی کا چہرہ دھندلا نہیں ہو گیا۔؟"

"ہاں ہو گیا ہے"

"کیا دنیا اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے"۔

"سچائی کا چہرہ دھندلا ہونے کے باوجود دنیا اسے پہچانتی ہے"۔

"تو پھر سچائی کو اپناتی کیوں نہیں؟"

"سچائی کو پہچاننا آسان ہے، اسے اپنانا نہایت دشوار ہے"۔

"کیوں دشوار ہے، ؟"

"انسان اور سچائی کے درمیان جھوٹ، گناہ اور منافقت کی دیوار کھڑی ہو گئی ہے"۔

"یہ دیوار کیسے گرے گی؟"

"جب انسان جھوٹ اور گناہ سے اور منافقت سے نفرت کرنے لگے گا"۔

"یہ نفرت کیسے پیدا ہوگی"۔؟

"خداوند خدا سے محبت کے نتیجے میں ایسا ہوگا"۔

"اور خداوند خدا سے محبت کب پیدا ہوگی۔؟"

"جب انسان کے نزدیک دنیا اور اس کے مفادات حقیر ہو جائیں گے"۔

"انسان کی نگاہوں میں اس کے مفادات کب حقیر ہوں گے؟"

"جذبہ قربانی سے"۔

"وہ کس طرح؟"

"جب انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے نفس کا اور اپنے مفادات کا گلا گھونٹ دے گا اور جذبہ قربانی سے کام لے گا تو سارے مفادات حقیر ہو جائیں گے اور خداوند خدا کی محبت ظہور کرے گی۔؟"

"یا پوپ پال! آزادی کیا ہے"؟

"وجود پر کسی خارجی دباؤ کا نہ ہونا آزادی ہے"۔

"اور غلامی"؟

"آزادی کا نہ ہونا ہی غلامی ہے!"

"کیا آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے"۔؟

"یقیناً یہ اس کا پہلا اور بنیادی حق ہے"۔

"کیا آزادی دنیا کے تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے"۔

"ہاں تمام انسانوں کا"۔

"یا پوپ پال! تو پھر آپ صرف پولش قوم کی آزادی کا حق کیوں مانگتے ہیں؟"
"میں نے صرف پولش قوم کی آزادی کا حق طلب نہیں کیا۔ میں نے عمومی بات کی ہے۔"
"مجھے اخبار پڑھتے ہوئے برسہا برس گزر گئے لیکن میں نے آج تک فلسطینی عوام کی آزادی کے لیئے آپ کا کوئی بیان کیوں نہیں پڑھا۔؟"
"میں اس عرصہ میں بہت مصروف رہا، پولش عوام کی آزادی کا مسئلہ بیحد اہم تھا۔"
"آپ بیحد انصاف پرور لگتے ہیں لیکن مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس پر ایک یہودی کی فائرنگ پر بھی آپ خاموش رہے۔ ایسا کیوں ہے؟"
"ہاں میں خاموش رہا!"
"کیا اس لئے کہ یہودی اور عیسائی دوست ہیں؟"
"نہیں عیسائی اور مسلمان بھی باہم دوست ہیں۔"
"تو پھر آپ خاموش کیوں رہے۔"؟
"پوپ عام طور پر خاموش رہتے ہیں۔"
"کیا اگر کوئی یہودی کسی چرچ پر گولیاں برسائے تو بھی آپ چپ رہیں گے۔؟"
"آپ کے سوالات تلخ ہو رہے ہیں۔"
"یا پوپ! کیا کوئی انسان، ملک یا حکومت سچائی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے؟"
"نہیں، ہرگز نہیں!"
"تو پھر ہم کیسے زندہ ہیں؟ ہم جو سچائی کو پہچانتے ہیں لیکن چپ رہتے ہیں۔"
"براہِ کرم چپ ہو جائیے!"
"کیا میں ہمیشہ کیلئے چپ ہو جاؤں۔؟"
"نہیں، جب اپنے مفاد میں آپ کا بولنا ناگزیر ہو جائے تو پھر بولئے۔"
"کیا اس طرح میں پوپ تو نہیں بن جاؤں گا۔"
"یہ سن کر پہلی بار پوپ پال کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میں جاگ گیا۔

گرتی ہوئی عمارتیں

کیا کبھی کسی نے سوچا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی چیزیں اتنی جلدی کیوں ٹوٹ جاتی ہیں؟۔ ہم پلازہ تعمیر کریں، ٹرمینل ٹو بنائیں یا مُلک۔ یہ سب کے سب بہت جلد دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ اپنی بنیاد ہی میں کمزور ہوتے ہیں یا ہم اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی حفاظت نہیں کرتے۔

گذشتہ دس پندرہ برسوں میں شہر کے اندر کتنے ہی پلازا بنے، نئی نئی بلڈنگیں کھڑی ہوئیں لیکن ایک پلازہ مکمل بھی نہ ہونے پاتا ہے کہ دوسرا گر جاتا ہے اور لوگ ملبے کے نیچے دب کر مر جاتے ہیں۔ ہر نئی عمارت کے منہدم ہونے پر غلغلہ سا اٹھتا ہے۔ شور مچتا ہے۔ انجینئر اور ٹھیکیدار کی ڈھونڈ پڑتی ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی بیٹھتی ہے، پھر بہت جلد یہ سب کچھ گرد و غبار کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور "پہلے آیئے اور پہلے پایئے" کی بنیاد پر فلیٹوں کی بکنگ جاری رہتی ہے۔ نئی عمارتوں کی تعمیر کا کام کبھی نہیں رکا۔

وہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، دنیا میں آنے والا ہر نیا بچہ اس بات کا اعلان ہے کہ ابھی نئے گھروں کی تعمیر کا کام جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جس طرح بعض خوش نصیب بچے پیدا ہونے کے تھوڑے عرصے بعد مر جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض عمارتیں بھی بننے کے فوراً بعد مر جاتی ہیں۔ ہم بچوں کی موت پر معترض نہیں ہوتے تو نئی عمارت کی وفات پر چیں بجبیں کیوں ہوں؟

اب کوئی پوچھے کہ آج سے پندرہ سال پہلے بننے والی عمارتیں کیوں نہیں گرتیں؟ کیا دھاندلی اور بے ایمانی پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہمیں کیا پتہ؟

کل ہی کی بات ہے کہ ہم نیٹی جیٹی کے پُل سے گزرے تو وہاں ایک نیا شاندار سا

پُل تعمیر تھا اور اس کے ساتھ ہی سو سال پُرانا پُل بھی اپنی خستہ حالی کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن اب اس کا عام استعمال ممنوع قرار پاگیا ہے۔ نیٹی جیٹی کے اس پُرانے پُل کی صرف پچھتر سال کی بقا کی ضمانت دی گئی تھی لیکن چونکہ یہ انگریزوں کا تعمیر کردہ تھا اس لئے سو سال گزر جانے کے باوجود صحیح سالم حالت میں استعمال ہو رہا تھا۔

انگریزوں کی تعمیر کردہ جاہ و جلال اور رعب و دبدبے سے بھرپور عمارتیں آج بھی موجود ہیں اور جانے ابھی اور کتنے دنوں تک موجود رہیں لیکن ہماری بنائی ہوئی عمارتیں اپنا رنگ و رُوپ نکالنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

بُرا ہو انگریزوں کا جو اپنی پتلون اور سی ایس پی افسران تو چھوڑ گئے لیکن اپنی دیانت اور دیگر خوبیاں ساتھ لے گئے۔

شارعِ فیصل پر عائشہ باوانی کالج سے صدر کی طرف چلیں تو ایک سَر بفلک پلازہ راستے میں پڑتا ہے۔ اس پلازہ سے متصل عمارت گر چکی ہے اور اب یہ پلازہ بھی یوں سَر اٹھائے کھڑا ہے جیسے کسی وقت بھی اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلا جائے گا۔ ہم اکثر اس کے قریب سے اپنا سَر بچا کر گزرتے ہیں۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ اس پلازہ کا دل بھی دنیا سے اُچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ داغِ مفارقت دینے ہی والا ہے۔ شاید اسی پلازہ کو دیکھ کر ایک بار صدرِ مملکت نے فرمایا تھا کہ میں کراچی میں اتنی بڑی بڑی بلڈنگیں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں ایک نیا پلازہ کھڑا دیکھتا ہوں، یہاں کے لوگوں کے پاس بہت دولت ہے لیکن قومی خدمت کے وقت یہ دولت کہاں چلی جاتی ہے؟ یہ لوگ اسکول اور کالج کیوں نہیں بناتے واقعی یہ بات درست ہے کہ پلازہ بنانے والے تعلیمی ادارے کیوں نہیں قائم کرتے اور یہ بات بھی درست ہے کہ بنیا یتیم خانہ کیوں نہیں قائم کرتا اور سود خور پٹھان قرضِ حسنہ کیوں نہیں دیتا۔

صاحب بات ہو رہی تھی عمارتوں کے گرنے کی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ عمارتیں صرف میٹریل خراب ہونے اور ڈھائی اور پانچ فیصد کمیشن لینے کی وجہ سے گرتی ہیں جبکہ دانشمند کہتے ہیں عمارتیں گرتی ہیں جب نیتوں میں فتور آجائے اور عمارتیں گرتی ہیں جب حکمران اپنے کئے ہوئے وعدے توڑ دیں اور عمارتیں گرتی ہیں جب دعائیں بے اثر ہو جائیں۔ (۲۸ جولائی ۸۲ء)

باادب باملاحظہ ہوشیار

صدر جب بھی کراچی آتے ہیں، ہمیں ان کی آمد کا فوری علم ہو جاتا ہے۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے نہیں۔ ان سپاہیوں سے جو ایئر پورٹ سے میٹرو پول تک، میلوں لمبی سڑک کے فٹ پاتھ پر مجسموں کی طرح ایستادہ ہوتے ہیں۔ بے حس و حرکت۔ سفید سفید وردیوں میں ملبوس کانسٹیبلوں کی بھاری تعداد ہر چوراہے پر موجود رہتی ہے اور صدر کے گزرنے سے قبل ٹریفک کا اژدہام کنٹرول کرنے کی نٹ پریکٹس کرتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے گھڑی کی سوئی مستقبل کی طرف سفر کرتی ہے۔ صدر کی آمد کا وقت سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح نزدیک آتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ اور اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور جب صرف چند منٹ باقی رہ جاتے ہیں تو موٹے موٹے ٹریفک انسپکٹروں کے چہروں پر رعب و دبدبے کی جگہ ایک قسم کی عاجزی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سواریوں سے کہہ رہی ہو۔ "دیکھنا عین موقع پر گڑبڑ نہ کر دینا۔"

نہ جانے کیوں ان سفید بے داغ وردیوں والے انسپکٹروں کو دیکھ کر جھیل کے کنارے ایک ٹانگ پر ایستادہ بگلوں کے جھنڈ بہت یاد آتے ہیں۔

صدر کی آمد سے قبل خوفناک سائرن بجاتی ہوئی جیپ زن سے گزرتی ہے۔ اس جیپ کے گزرنے کا مطلب ہوتا ہے، عوام کی گاڑیاں جہاں کہیں بھی ہیں رک جائیں۔ ٹھہر جائیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جیپ کے گزرنے کے بیس بیس منٹ بعد تک ٹریفک اپنی جگہ پر جام رہتا ہے کیونکہ انہیں ہلنے جلنے یا آگے پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں ہوتی، تب دو پھول والے ٹریفک انسپکٹروں کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، وہ ادھر ادھر بھاگ رہے

ہوتے ہیں۔ کسی گاڑی کو کھسکنے اور کسی بس کو کنارے لگنے کا اشارہ کرتے ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں۔ اگر ان کے احکامات کی تعمیل میں تاخیر ہو رہی ہو تو اُن کا بس نہیں چلتا کہ اپنے سر کے بال نوچ لیں یا اندھا دھند ہنٹر چلانا شروع کر دیں۔ چوراہوں اور سگنلوں پر رُکی ہوئی گاڑیوں میں سے لوگ سر باہر نکال کر صدر کی راہ تکتے ہیں اور جب ان کی کار کی آمد میں تاخیر ہو تو اپنے آپ کو خاصا چغد محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی برطانیہ کی مثال لاتا ہے جہاں وزیر اعظم کی کار عام کاروں کے ساتھ سرخ سگنل پر ٹھہر جاتی ہے اور کوئی حضرت عمرؓ کا حوالہ دیتا ہے۔ جب انھیں کسی نے باڈی گارڈ رکھنے کا مشورہ دیا تو آپؓ نے فرمایا کہ میں عوام کا محافظ ہوں، وہ میرے محافظ نہیں لیکن ان اچھی باتوں کا صرف اتنا سا نتیجہ نکلتا ہے کہ وقت آسانی سے کٹ جاتا ہے اور صدر کی کار کا انتظار زیادہ کربناک ثابت نہیں ہوتا۔

صدر کی شہر میں موجودگی تک مقامی انتظامیہ کی جان پر بنی رہتی ہے۔ وہ اپنے سارے ذرائع و وسائل صدر کے تحفظ کے لئے وقف کر دیتی ہے لیکن اُن کے روانہ ہوتے ہی سب سکون کی ٹھنڈی سانس لیتے ہیں اور سردی زیادہ ہو تو لحاف تان کر سو جاتے ہیں یوں بھی صدر کے آنے کا وقت تو مقرر ہوتا نہیں ہے وہ کبھی صبح کو آجاتے ہیں۔ کبھی شام کو اور کبھی رات گئے۔ وہ کسی وقت بھی آئیں انتظامات تو ہمیشہ ایک جیسے ہی کرنے پڑتے ہیں بلکہ امن و امان کی فضا خراب ہونے کی صورت میں انتظامات میں سختی آجاتی ہے۔ میں نے اکثر راتوں اور بالخصوص سردیوں کی راتوں میں معمولی سپاہیوں اور کانسٹیبلوں کو صدر کی روانگی کے بعد سنسان سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں ٹھٹھرتے دیکھا ہے اور ہمدردی کے جذبے کے تحت انہیں لفٹ بھی دی ہے۔ صدر کی آمد و روانگی کے بارے میں اُن کے تاثرات جاننے کیلئے جب بھی ان سے گفتگو کی ہے، انہیں ہمیشہ ناآسودہ پایا ہے۔ وہ شہر میں صدر کی آمد کو اپنے لئے دردِ سر قرار دیتے ہیں اور اس کے بیان میں کبھی مسرت محسوس نہیں کرتے۔ انہیں صدر کی آمد پر مستعدی سے اپنے فرائض ادا کرنے پر کوئی خصوصی الاؤنس نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ کنوئنس الاؤنس یا اوور ٹائم بھی نہیں! اسی لئے انہیں رات گئے تک

مجھ جیسے ہمدردوں کے انتظار میں سڑنا پڑتا ہے۔ میں نے ان سے مذاقاً پوچھا ہے کہ اگر وہ اس ملک کے صدر ہو جائیں تو کیا ایسے حفاظتی اقدامات ختم کرا دیں گے؟ وہ چپ رہے اور انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ہے جیسے میں نے ان کا مذاق اڑایا ہو۔

ان سپاہیوں کو کئی گھنٹے تک فٹ پاتھوں پر اٹین شن رہنا اس لئے بھی کھلتا ہے کہ اتنے عرصے وہ پبلک کے تضحیک آمیز رویے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر برے برے اشارے کرتے ہیں اور گزرتے ہوئے "ٹلا ٹلا" کی آوازیں لگاتے ہیں اور ہاتھ میں بندوق ہونے کے باوجود بے بسی اُن کے وجود پر مسلط رہتی ہے۔

دوسرا رُخ

اگر والٹیر جیسے ادیب ہمارے معاشرے میں پیدا ہوتے اور کہتے کہ:

"مجھے آپ سے اختلاف ہے لیکن میں آپ کے اس حق کیلئے ہمیشہ لڑتا رہوں گا کہ آپ مجھ سے اختلاف کر سکیں"۔ تو ہم میں سے کوئی لمبی سی جمائی لے کر کہتا:

"اب چپ بھی ہو جاؤ، کیا بک بک لگا رکھی ہے"۔

(۲۳ ستمبر ۸۱ء)

کیپ کی یاد میں

پچھلی گرمیوں کی کڑی دھوپ نے کہا کہ تمہیں ایک کیپ کی ضرورت ہے اور میں نے دھوپ کے سامنے ہتھیار پھینک کر فیصلہ کیا کہ میں جلد ہی ایک عدد کیپ خرید لوں گا۔

"آیئے آیئے" کاؤنٹر پر براجمان دکاندار خالص کاروباری انداز میں مسکرایا۔ شاید میں اُسے ایک اچھا مرغا نظر آیا تھا۔

چند ہی لمحے میں اس نے میرے سامنے رنگ برنگی ٹوپیوں اور کیپوں کا ڈھیر لگا دیا۔ نیلی، پیلی، سرخ و سیاہ کیپس، جنھیں میں باری باری پہن کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتا تھا اور ہر بار اپنے مقابل ایک اجنبی کو پاکر اتار دیتا تھا۔ "نہیں بھئی، یہ نہیں کوئی اور دکھایئے"۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد دکاندار کی کھلی ہوئی باچھیں مرجھانی شروع ہو گئیں۔ اب وہ اخلاقاً مجھے قائل کرنا چاہ رہا تھا۔ "جناب! یہ جاپانی کیپ ہے اور یہ امریکن ہے' اسے ہالی ووڈ کے ہیرو پہنتے ہیں۔ یہ کاؤ بوائے فلموں میں بے حد مقبول ہے' اسے پہن کر آپ رنگین لگ رہے ہیں اور اس میں آپ پر بیگن کا شبہ کیا جا سکتا ہے' وغیرہ۔ لیکن اس کی تمام تقریریں رائیگاں جا رہی تھیں کیونکہ میرے ذہن میں جس کیپ کا ہیولیٰ تھا' وہ وہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی' اتنے میں ایک اور صاحب دکان میں داخل ہو گئے۔ دکاندار مجھے کیپ پسند کرنے کا کہہ کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پہلے میں اس کی گرم جوشی سے ہراساں ہو کر اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا اور غالباً اب وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ نئے گاہک کی آمد نے دکاندار کی آٹومیٹک باچھوں کو ایک بار پھر کھل اٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ اپنے مخصوص حربے

نئے گاہک پر آزمانے لگا لیکن آنے والا بھی جہاندیدہ تھا۔ اس نے کئی کیپ پہنے اور ہر میں کوئی نہ کوئی خامی بتا کر اُسے مُسترد کرتا گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ہم گاہکوں کا رویّہ خوش مزاج دکانداروں سے کتنا ظالمانہ ہوتا ہے لہٰذا جونہی خوش پوش گاہک نے ایک ہیٹ اٹھا کر اپنے سر پر سجایا۔ میں دُور ہی سے چلّا اٹھا۔ "بیوٹی فل! جواب نہیں" وہ مڑا اور استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ "جناب! اس میں آپ بالکل گریٹا گاربو لگ رہے ہیں"۔ اجنبی، گریٹا گاربو کو کوئی مَرد اداکار جان کر خوش ہوا اور سَر کے خم سے شکریہ ادا کیا۔ "تو یہ ٹھیک رہے گا نا"۔ اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ ہیٹ پہن کر بالکل بکو اس دِکھائی دے رہا تھا لیکن دکاندار کے افسوسناک چہرے کے پیشِ نظر میں نے کہا۔ "بہت زبردست، بہترین، کوئی مقابلہ نہیں"۔ اس نے پھر سر کو ہلکا سا خم دیا، دکاندار کو رقم ادا کی اور دکان سے نکل گیا۔ میں نے دکاندار کو فاتحانہ نظروں سے تکا۔ وہ خوش تھا، اس نے مجھے مطلوبہ کیپ پر معمولی سی رعایت بھی دی اور الوداع کہتے ہوئے اس ممنونیت سے دیکھنے لگا جیسے کل دوبارہ آنے کے لئے کہہ رہا ہو۔

اِدھر کیپ پہن کر میرے اندر بھی ایک لااُبالی پن سا آگیا۔ میں نے بے فکری سے ہونٹ سکوڑ کر ہلکے ہلکے سُروں میں سیٹیاں بجانے کی کوشش کی لیکن بُری طرح ناکام رہا۔ میں مزید کوشش کرتا لیکن اتفاق سے موٹر سائیکل کی سائیڈ مرر میں اپنا چہرہ نظر آگیا، اور میں نے جھینپ کر مزید سیٹیاں بجانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ قریب سے ایک فرسٹریٹ کرنے والی کار گزری تو میں نے گردن موڑ کر تک دینا چاہا لیکن ہوَا کے تیز جھونکے سے کیپ اُڑ گئی اور میں نے غصّے میں ہوَا کو گھُورا اور کیپ اٹھانے کے لئے مُڑ گیا۔ ایک فٹ پاتھیا ہنس پڑا اور میں اس سے اُلجھتے! اُلجھتے رہ گیا۔ رہ یوں گیا کہ اس کی صحت پر مجھے رحم آگیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ اچھی تھی۔

دفتر پہنچ کر میں نے کیپ اتار کر میز پر اس طرح رکھ دی کہ ہر آنے جانے والے کی نگاہ مجھ سے پہلے اس کیپ پر پڑے۔ اس موقع پر کیپ نے بھی تعاون کیا اور اچھا پوز دیا۔ البتہ ایک آدھ ٹیلیفون ریسیو کرتے ہوئے میں نے کیپ کو جان بوجھ کر پہن لیا۔

ایسا کرتے ہوئے میرا خیال تھا کہ ٹیلیفون پر میرا مخاطب بعض تکنیکی وجوہ کی بنا پر کیپ کے نظارے سے محروم رہے گا۔ لیکن کیپ کی سر پر موجودگی سے احساس سے میری آواز ماضی کے مقابلے میں خاصی خوشگوار ہو گئی۔ اس سے میرے مخاطب کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اپنی ان دو کتابوں کی واپسی کا بلا تکلف مطالبہ کر دیا جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے ایک ہفتے کے وعدے پر میں نے عاریتاً لے رکھی تھیں۔

دفتر کے معمول کے کام نمٹانے کے دوران میرا ایک پرانا اور عزیز ترین دوست آ گیا چونکہ وہ کافی طویل عرصہ بعد ملا تھا۔ اس لئے ہم دونوں نے اپنے تعلقات میں ایک تکلف اور حجاب سا محسوس کیا۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے درمیان اس نے بے خیالی میں (یا شاید ارادتاً) کیپ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کی یہ ادا بالکل نہ بھائی لیکن ظاہر ہے میں اسے منع تو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک اور غضب ہوا۔ اس نے بے دھیانی میں (یا شاید سوچے سمجھے منصوبے کے تحت) کیپ اپنے سر پر رکھ لی اور نہایت سنجیدہ موضوع کا دروازہ کھول دیا۔ گو موضوع میرا پسندیدہ تھا لیکن اس میں اُلجھ کر پُر جوش ہونے کا مطلب تھا کہ میں کیپ کو فراموش کر دوں اور وہ اسے واپس کرنا بھول جائے لہٰذا میں نے اس موضوع میں خاطر خواہ دلچسپی ظاہر نہ کی۔ اب تو میری دلچسپی صرف اس میں تھی کہ وہ شرافت سے کیپ اتار کر رکھ دے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جونہی وہ کیپ اتارے گا میں اُسے اٹھا کر اپنی دراز میں رکھ لوں گا لیکن وہ کیپ اتار کب رہا تھا؟ اور ساری الجھن یہ تھی کہ میں اس سے کیپ اتارنے کی درخواست بھی نہیں کر سکتا تھا ورنہ وہ مجھے کتنے چھوٹے دل کا آدمی سمجھتا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے گفتگو کا رُخ موڑ کر کیپ کو موضوع بنانا چاہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ کیپ کا موضوعِ گفتگو بنتے ہی کسی بھی بہانے میں اس کے سر سے کیپ اُتروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن بدقسمتی سے اس نے میری ہر اُس بات کا جو بالآخر کیپ کو دائرۂ بحث میں گھسیٹ لانے والی تھی، "قطع کلامی معاف" کہہ کر حرفِ غلط کی طرح کاٹ ڈالا۔

اور پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی جو اس کی رخصتی کا پیشگی اعلان تھا۔ دل نے کہا

"جلدی کرو، کہدو کہدو"۔ لیکن یہ کہنے کے ساتھ ساتھ دل خود بھی دھڑکنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اس نے ہاتھ ملایا اور پھر ملنے کا کہہ کر جدا ہو گیا۔ وہ جا رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور کیپ، میری پیاری کیپ وہ بھی مجھ سے منہ موڑ چکی تھی۔ میرا جی چاہا، اپنے بال نوچوں، اپنے آپ کو دو چار زوردار قسم کے گھونسے لگاؤں لیکن یہ سوچ کر میں نے اپنے کو تھپتھپایا کہ یقیناً اس میں میری غلطی ہے اور اسے کیپ واپس کرنا یاد نہیں رہا ہوگا اور اگلی ملاقات میں وہ معذرت کے ساتھ کیپ واپس کر دے گا۔ اس واقعہ کو کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ وہ دوبارہ مجھ سے ملنے نہیں آیا ہے اور میں خود اس سے ملاقات کرنے میں پہل کرنا نہیں چاہتا، مبادا کہیں وہ یہ تصور نہ کر لے کہ میں اس سے کیپ واپس لینے آیا ہوں۔

(۲۰، جولائی ۸۲ء)

مریض کی مسکراہٹ

کامیاب آپریشن کے اگلے دن ڈاکٹر اور مریض دونوں مسکراتے ہوتے نظر آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مریض ایک ٹانگ کے بغیر مسکرا رہا ہوتا ہے۔

(۱۶، ستمبر ۸۱ء)

تاریک آسمان پر ایک ستارہ

سُنا ہے بابر ہاتھی کی سواری کا مخالف تھا کہ گھوڑے کی طرح اس کی لگام سوار کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ سوار مہاوت کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ ہم بھی گزشتہ ۳۵ سال سے ہاتھی پر سوار مہاوت کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں۔ کہیں تاریکی بڑھ جاتی ہے تو پوچھتے ہیں :

"مہاوت ! سفر کا انجام کیا ہوگا ؟"

"انجام بخیر ہوگا" مہاوت دلاسہ دیتا ہے۔

"مگر ہمیں یہی نہیں پتہ کہ ہم جا کدھر رہے ہیں"۔

"اتنا کافی ہے کہ میں جانتا ہوں"۔ وہ کہتا ہے۔

"لیکن ہمیں بھی تو معلوم ہونا چاہیئے، تم کس سمت لئے جارہے ہو؟"

"وہ خاموش رہتا ہے جیسے سوال ہی نہ سنا ہو۔ سوال کی تکرار ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے۔" کیا تم نے سنا نہیں"؟

"میں نے سُن لیا ہے۔ لیکن تم بھول رہے ہو کہ میں تمہیں جواب دینے کا پابند نہیں ہوں"۔ مہاوت کے لہجے میں سختی ہے۔ اس کے بعد انجانے خوف اور اندیشے چاروں سمت سے حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ سفر کرنے والے مایوسی کے نوکیلے پنجوں کو اپنی پشت میں پیوست محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اپنے دکھ اور تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مہاوت آرام سے بیٹھا ہے۔ وہ مسافروں کی اداسی کو جان کر آنسو پونچھنے والی ہمدردی کے چند بول ادا کرتا ہے۔" آپ لوگ فکرمند نہ ہوں، سفر کا انجام بخیر ہوگا۔ ہم صبح تک پہنچ جائیں گے"۔

"مگر صبح کب آئے گی"

"صبح آجائے گی، میں اُسے لیکر آؤں گا!" مہاوَت خم ٹھونک کر کہتا ہے۔ سَب جانتے ہیں، یہ محض بَڑ ہے۔ رات طویل ہوتی جا رہی ہے اور صبح کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ مجبوراً وہ اپنے اپنے اسباب میں سے وَقت کاٹنے کیلئے مختلف مشاغل کے سامان نکالتے ہیں اور ان میں مگن ہو جاتے ہیں، ان کے قہقہے گونجتے ہیں تو مہاوَت خوش ہوتا ہے۔

"اچھا ہی ہے کہ یہ مصروف رہیں"۔

"لیکن جب اِن کا جی اِن مشاغل سے اکتا جاتا ہے تو وہ اپنے اطراف میں پڑے پردے کو سرکا کر باہر دیکھتے ہیں۔

"ہم کافی دور نکل آئے ہیں"۔

"دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ہم اپنے مقصد کے نزدیک ہو چکے ہیں"۔ مہاوَت ٹکڑا لگاتا ہے۔

"کونسا مقصد؟" کوئی پوچھتا ہے۔

"وہی جسے پانے کیلئے ہم عازمِ سفر ہوئے تھے"۔

"مجھے یاد نہیں رہا، وہ کون سا مقصد تھا؟" وہی آواز پھر کہتی ہے۔

"تم نے دیکھا، تمہارے اندر کیسے کیسے فریبی لوگ شامل ہیں جو تمہیں تمہارے مقاصد سے دُور کر دینا چاہتے ہیں"۔ مہاوَت سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے "اِن حالات میں سَفر کا رُخ صحیح سمت میں جاری رکھنا میرا فرضِ اوّلین ہے۔ میں اِس سے کوتاہی نہیں کر سکتا"۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرتے رہو"۔ ایک آدھ آوازیں مہاوَت کی حمایت میں بلند ہوتی ہیں۔

"یہ خوشگوار آوازیں کس کی ہیں؟" مہاوَت پوچھتا ہے۔ "جن کی یہ آوازیں ہیں، وہ مجھ سے قریب آجائیں"۔

اُس کی اِس بات پر حمایتی آوازیں اُس کے نزدیک آجاتی ہیں۔ باقی سب خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ جو مہاوَت کے نزدیک ہیں، وہ بھی اور جو دُور ہیں، وہ بھی، نہیں

جانتے کہ سفر کا اختتام کہاں ہوگا؟ انجام کیا ہوگا؟ لیکن نا امیدی اور مایوسی کی کوئی بات نہیں کہ تاریک آسمان پر ایک ستارہ اب بھی ٹمٹما رہا ہے۔ !

(یکم مارچ ۸۳ء)

آزادی کا چہرہ

لیکن اگر ان آٹھ کروڑ باشندوں سے کبھی پوچھا جائے۔ "آزادی کیا ہے ؟"
تو کوئی ہپی چرس بھری سگریٹ کا کش لے کر کہے گا:
"آزادی اس سگریٹ کے دھوئیں کا نام ہے۔" کوئی قانون شکن اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے چیخے گا۔ "میں ابھی آزادی کی تعریف بیان کرتا ہوں۔"
اتنا کہہ کر وہ سگنل توڑتا ہوا، ٹریفک کانسٹیبل کی چیختی سیٹی سے بے پرواہ فراٹے بھرتا نکل جائے گا۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر اونگھتا ہوا کلرک بیزاری سے کہے گا: "براہِ کرم میری آزادی میں مداخلت نہ کریں، رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔" یہی سوال کرنے کسی افسر کے پاس جائیں تو وہ فائلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے اپنا سر اٹھا کر رعونت سے فرمائیں گے۔ "پہلے یہ بتائیں کہ آپ کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت کس نے دی ہے؟" مسجد کے منبر پر تشریف فرما مولوی صاحب نفیس اور شستہ آواز میں کہیں گے۔ "جن حضرات کو ہمارے مسلک سے اختلاف ہو، وہ کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔" پولیس افسر اپنا پیر پٹخ کر حکم دے گا۔ "اوئے اینہوں تھانے وچ بند کر دیو، ایہہ آزادی دی گل کردا اے۔" سیاستدان عیاری سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہے گا۔ "آزادی کی تعریف یہ ہے کہ سیاستدانوں کے بیانات اخبارات کی زینت بنتے رہیں۔" غریب اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرے گا کہ اس جہنم کو بھرنے کی راہ میں کسی رکاوٹ کا نہ ہونا ہی آزادی ہے اور رنگین مزاج وی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے، عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے، ریس کورس میں جیکی کے دوڑنے ہی کو آزادی کہیں گے۔ آزادی کی ان گنت تعریفیں ابھی باقی ہیں۔

(۱۲ اگست ۸۱ء)

"گوگاشیر" کی کہانی

مرکزی فلم سنسر بورڈ نے پنجابی فلم "گوگاشیر" کی نمائش پر چھ ماہ تک کیلئے پابندی لگادی ہے۔ بورڈ نے فیصلہ کرنے سے پہلے فلم "گوگاشیر" کے پروڈیوسر کا موقف بھی صبر و سکون سے سُنا اور اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا۔ جب "گوگاشیر" کے پروڈیوسر کو بورڈ کے سامنے طلب کیا گیا ہوگا تو بورڈ کی حیثیت عدالت کی اور پروڈیوسر کی کیفیت ملزم کی سی رہی ہوگی۔ سُنا ہے ڈاکٹر صفدر محمود جب سے سنسر بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے ہیں۔ فلمیں اور بالخصوص پنجابی فلمیں جنھیں ماضی میں سنسر بورڈ پاس کرچکا تھا، دھڑا دھڑ ری سنسر ہو رہی ہیں۔ فلمساز اور پروڈیوسر حضرات بورڈ کے اراکین کے آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں اور جب بورڈ کا اجلاس ہوتا ہے تو کمرے کے باہر فلمسازوں اور پروڈیوسروں کا ہجوم لگا رہتا ہے تاکہ رُکی ہوئی فلمیں کلیئر ہو سکیں۔ اس پس منظر میں آپ تصور کیجئے کہ جب فلم "گوگاشیر" کے پروڈیوسر بورڈ کے سامنے پیش ہوئے ہوں گے تو صورتِ حال کس قسم کی رہی ہوگی۔

دروازے پر موجود چپراسی نے پکارا ہوگا۔ "پروڈیوسر فلم گوگاشیر"!۔

"حاضر جناب"۔ پروڈیوسر نے کہا ہوگا اور جلدی سے فائلیں بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہو گیا ہوگا۔ اندر چیئرمین اور بورڈ کے اراکین نے اُن کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد سر کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی ہوگی۔

چیئرمین فلم سنسر بورڈ: "تو آپ ہی ہیں جس نے فلم "گوگاشیر" بنائی ہے۔!"

پروڈیوسر: "یس سر!"

چیئرمین : "ہم سب" سے کیا مُراد ہے۔؟

پروڈیوسر : میرا مطلب ہے مصنف، ہیرو، ہیروئن کی ماں جو سیٹ پر ہیروئن کی رکھوالی کیلئے آتی ہے، میرا ایک دوست جس کا فلم پر پیسہ لگا ہے، ایک فلمی جرنلسٹ اسٹوڈیو کا چوکیدار، چائے لانے والا، میک اپ مین، کیمرہ آپریٹر، میری اہلیہ، میرا چھوٹا بچہ جو مجھے بہت عزیز ہے، ایک انڈین فلم، تین پنجابی فلمیں۔ غرضیکہ فلم "گوگا شیر" کی تیاری پر ہم نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔

چیئرمین : "مائی گاڈ! کیا اتنی محنت کرنے کے بجائے یہی کہانی کسی ایک مصنف سے نہیں لکھوا سکتے تھے؟

پروڈیوسر : سر! میرا بچپن سے اصُول رہا ہے کہ میں ہر کام سَب کے مشوروں سے کرتا ہوں اور پھر دیکھئے نا، دس آدمیوں کی سمجھ کتنی ہی خراب ہو لیکن ایک آدمی کی عقل سے تو بہتر ہوگی، کیوں؟

چیئرمین : پروڈیوسر صاحب! آپ کیسی احمقانہ بات کر رہے ہیں۔ ساری دنیا میں فلم کی کہانی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مصنف مل کر لکھتے ہیں۔ ٹی وی پر دیکھئے، کتنے پاپولر سیریلز ایک ہی ڈرامہ نگار لکھتا ہے۔

پروڈیوسر : سر! ٹی وی کے لکھنے والے ہم سے تعاون نہیں کرتے!

چیئرمین : کیا آپ نے کسی سے رابطہ کیا تھا؟

پروڈیوسر : میں امجد اسلام امجد سے مِلا تھا اور "گوگا شیر" کا آئیڈیا انہیں سُنایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہت زبردست آئیڈیا ہے اور اس کے لئے کوئی بہت بڑا ڈرامہ نگار چاہیئے۔ شیکسپیئر یا آغا حشر کاشمیری جیسا اور آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ مجھ سے معذرت کرنے کے بعد امجد صاحب "گوگا شیر" کا آئیڈیا لے اُڑے۔ وہ آج کل اسی آئیڈیا پر ٹی وی ڈرامہ سیریل لکھ رہے ہیں۔ البتہ انہوں نے "گوگا شیر" کا نام بدل کر "سمندر" رکھ دیا ہے۔

چیئرمین : (حیرت سے) اچھا تو "سمندر" آپ کی فلم "گوگا شیر" کا سرقہ ہے۔؟

پروڈیوسر : بالکل سر، سو فیصدی۔

چیئرمین : "آپ نے اپنی زندگی میں کبھی شیر دیکھا ہے۔؟"

پروڈیوسر : جی ہاں جناب کئی بار دیکھا ہے بلکہ ایک مرتبہ جب میری عمر ۱۸ سال تھی، میں بیس منٹ تک شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہا تھا۔

چیئرمین : پھر شیر نے آپ کو کچھ نہیں کہا۔

پروڈیوسر : کچھ بھی نہیں، اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اونگھنے لگا۔

چیئرمین : آپ اصل واقعہ بھول رہے ہیں۔ آنکھیں آپ نے بند کرلی ہوں گی اور بے ہوش ہو گئے ہوں گے۔

پروڈیوسر : قسم لے لیجئے آپ، شیر اُونگھنے لگا تھا۔

چیئرمین : "آپ نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟"

پروڈیوسر : "چڑیا گھر میں"۔

(چیئرمین سمیت اراکین بورڈ ہنسنے لگتے ہیں)

چیئرمین : (سنجیدگی سے) بورڈ نے آپ کی فلم "گوگا شیر" نہایت دلچسپی اور توجہ سے دیکھی لیکن کئی بار دیکھنے کے باوجود اس کی کہانی ہماری سمجھ سے بالاتر رہی۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ فلم "گوگا شیر" کی کہانی کا مقصد کیا ہے؟ اور آپ نے اس کے ذریعے کیا کہنا چاہا ہے۔

پروڈیوسر : حضور میں نے کہانی اکیلے تو لکھی نہیں ہے، اس لئے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

چیئرمین : کہانی کا اصل مصنف کون ہے؟

پروڈیوسر : یہ بتانا بہت مشکل ہے جناب، اس لئے کہ کہانی کئی آدمیوں نے مل کر لکھی ہے۔

چیئرمین : "آپ ان افراد کے نام بتانا پسند کریں گے۔؟

پروڈیوسر : (جھجکتے ہوئے) آپ انہیں تو کچھ نہیں کہیں گے۔؟

چیئرمین : "آپ بے فکر رہیں، ہم انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔

پروڈیوسر : کہانی کا آئیڈیا تو اس ناچیز کا ہے، باقی پوری کہانی کا تانا بانا ہم سب نے مل کر بُنا ہے۔

چیئرمین : لیکن آپ کی فلم اور ڈرامہ سیریل میں مجھے تو کوئی مماثلت نظر نہیں آئی ؟

پروڈیوسر : اس کی وجہ یہ رہی کہ ڈرامہ شروع ہونے کے بعد میں نے فلم کی کہانی مجبوراً بدل دی اور یہ سوچ کر بدلی کہ سمندر سے ایک چلّو پانی چُرا لینے سے سمندر کی صحت پر کیا فرق پڑتا ہے۔ چاہے امجد صاحب اس چلّو بھر مسروقہ پانی کا نام سمندر ہی کیوں نہ رکھ دیں۔

چیئرمین : بہرکیف، اس کے باوجود ہمیں افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی فلم "گوگا شیر" افسوسناک حد تک بیکار، بے مقصد اور واہیات ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو فلمیں بنانے کا مشورہ کس نے دیا۔؟

پروڈیوسر : جناب! یہ تو بڑی لمبی کہانی ہے۔ سناؤں گا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔

رُکن سنسر بورڈ : (کھنکھارتے ہوئے) کیا "گوگا شیر" کی کہانی آپکی ذاتی کہانی ہے؟

پروڈیوسر : (رُندھی ہوئی آواز میں) میں آپ کی بات کو رَد نہیں کروں گا۔

رُکن : "تو کیا آپ کی نجی زندگی سے اسٹوڈیو کے چائے والے سے لیکر آپ کا بچہ تک واقف ہے۔؟

پروڈیوسر: میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ع پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

دوسرا رکن : اچھا بوٹے صاحب! یہ بتائیے کہ آپ نے اپنی فلم کا نام "گوگا شیر" کیوں تجویز کیا۔؟

پروڈیوسر: جناب ہم نے پہلے اس کا نام "گونگا شیر" رکھا تھا لیکن ہیروئن کی ماں نے فرمائش کی کہ گونگا کے بجائے گوگا شیر رکھا جائے، جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں ہر کام دوسروں کی پسند اور مشورے سے کرتا ہوں اس لئے میں نے فلم کا نام بدل دیا۔

چیئرمین: "اور اب آپ کو سُنکر خوشی ہوگی کہ سنسر بورڈ بھی اپنے فیصلے اراکین کے مشورے سے کرتا ہے اور بورڈ نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی فلم "گوگا شیر" چھ مہینے تک نمائش کیلئے پیش نہیں کی جاسکے گی۔

اُداسی بے سبب ہے

ایک ڈیڑھ ہفتے سے ہم بہت اُداس ہیں۔ زندگی بجھی بجھی اور افسردہ سی لگنے لگی ہے۔ کئی بار تنہائی میں بیٹھ کر اُداسی کا سبب ڈھونڈنا چاہا لیکن اداسی کی تہہ میں اُترے تو وہاں بھی اداسی ہی ملی۔ غرضیکہ اس بے وجہ، بلا سبب اُداسی نے دنیا سے ایسی بے رغبتی پیدا کی کہ ہر چیز سے جی اچاٹ ہو گیا۔

کل ہی کی بات ہے!

بھائی صاحب نے پچاس روپے کا نوٹ اور تھیلا تھماتے ہوئے ہدایت کی کہ بازار سے سبزی اور گوشت لے آؤ۔ ہم نے نوٹ جیب میں رکھ کر تھیلا واپس کرتے ہوئے جواب دیا کہ یہ کام کسی اور سے کرالیں۔

انہوں نے پوچھا: "کیوں آپ کیوں نہیں کریں گے۔"

"دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"آپ تو اچھے بھلے تھے، یہ ایک دم آپ کے دل کو کیا ہو گیا۔"

"کچھ بھی تو نہیں، بس ذرا اُداس ہے۔"

"ماشاءاللہ۔" بھائی صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اب آپ بھی اُداس رہنے لگے ہیں۔"!

ان کا چلایا ہوا طنز کا یہ تیر سیدھا ہمارے دل میں پیوست ہو گیا اور اس سے پہلے کہ ہماری آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ انہوں نے میری جیب میں رکھے ہوئے پچاس کے نوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"اچھا بازار نہیں جاتے ہیں نہ جائیں لیکن پیسے تو واپس کر دیں"۔

"پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں"۔

"لیکن پیسے تو لوٹا دیں"

"دیکھئے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

"آپ کی طبیعت گئی جہنم میں ۔ پیسے نکالئے"۔

بھائی صاحب نے گرج کر کہا اور ہم نے سہم کر جلدی سے پچاس روپے واپس کر دیئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے نہایت رنجیدہ ہو کر سوچا "کاش میرے دکھ کو کوئی سمجھ سکتا"۔

مسلسل اداسی کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ہماری بھوک کھُل گئی اور ہماری خوراک میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا۔ پہلے ہمارے سامنے جو کچھ رکھا پھیکا رکھا جاتا، بغیر چوں چرا کئے ہم اُسے ہضم کر لیتے۔ اب یہ ہوا کہ گھر آکر پہلے پوچھتے کہ کیا پکا ہے؟ اور اپنی من پسند چیز نہ پکنے پر قریبی ہوٹل میں جا کر نہایت غمگین دل کے ساتھ چکن تکہ اور کباب اڑاتے اور بجھے بجھے قدموں سے گھر لوٹ آتے مگر گھر ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہر شے وحشت زدہ سی لگتی۔

"آخر نجات کا راستہ کیا ہے؟ انسانوں کے دُکھ کب ختم ہوں گے"؟

ہم نے بالآخر گوتم بدھ کی طرز پر سوچنا شروع کیا۔ یقین جانیں اگر ہم کسی راجہ کے بیٹے ہوتے تو تاج و تخت کو ٹھوکر مار کر نِروان کی تلاش میں برگد کے پیڑ کے نیچے جا بیٹھتے لیکن نہ ہمارا تعلق راجہ مہاراجہ کے خاندان سے تھا اور نہ گھر کے قریب برگد کا کوئی پیڑ تھا۔ اگر تھا تو بجلی کا ایک پُرانا بوسیدہ کھمبا۔ کھمبے کے نیچے نِروان اُترنے کا کوئی امکان نہ تھا اس لئے اس کے تلے بیٹھنا بھی فضول ہی تھا۔

ایک دِن نازش چنگیزی مِلنے آئے ۔ پوچھا۔

"سناؤ کیسے ہو؟"

"زندہ ہوں"۔

"کیا بات ہے کچھ ڈیپریس ہو؟"

"ہاں، دِل اُداس ہے۔"

"کیوں؟"

"یہی تو پتہ نہیں"

"رات کیا کھایا تھا؟"

"اُداسی کا کھانے سے کیا تعلق!"

"بہت گہرا تعلق ہے، بتاؤ تو سہی۔"

"چکن کری، سَلاد، رائتہ، روٹیاں اور میٹھے میں شاہی ٹکڑے۔"

"پھر اداس تو نہیں ہونا چاہیئے۔" انہوں نے زیرِلب کہا۔

"لیکن پھر بھی اداس ہوں اور آج سے نہیں کئی روز سے ہوں۔"

"کِسی سے قرض لِیا تھا؟"

"لِیا تھا۔"

"واپس کر دیا؟"

"نہیں کیا۔"

"واپسی کا تقاضا ہر روز ہوتا ہے۔"

"پہلے ہوتا تھا، اَب تنگ آ کر تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"خوش قِسمت ہو" نازش چنگیزی مسکرائے۔ "تمہاری قمیض کی گردن کی ناپ کِتنی ہے؟"

"یہ تو درزی ہی بتا سکتا ہے۔"

"درزی سے فوراً پتہ کرو۔ ہمارے ایک دوست تھے، ان کے کانوں میں ہر وقت شائیں شائیں کی آواز آتی تھی۔ نِگاہوں کے سامنے چنگاریاں اڑتی تھیں اور کِسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قمیض کا کالر تنگ ہے۔ یہ واقعہ ایک کالم نویس نے قلمبند بھی کیا ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے نازش صاحب کہ ہماری اداسی کا آپ نے اتنا سطحی سبب بتایا۔" ہمیں جلال آگیا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ جہاں سے میں قمیضیں خریدتا ہوں، وہاں کے کالر کبھی تنگ نہیں ہوتے کیونکہ امریکی ہمیشہ صحتمند ہوتے ہیں اور ان کی گردن بھی موٹی ہوتی ہے۔"

"عزیزم پھر کیا تم کسی میں....."

"بالکل نہیں، یونیورسٹی کا دور تو گیا۔ اب اتنی فرصت کہاں؟"

"اچھا' اب میں بالکل صحیح صحیح تمہاری اُداسی کا سبب بتاتا ہوں۔"

"فرمائیے"!

"تمہاری اُداسی ایک فراڈ، ایک جھوٹ اور ایک بکواس ہے۔ اب سیدھی طرح انسان بن جاؤ۔ سمجھے۔"

"پھر پکچر دکھا رہے ہو؟" ہم نے مسکین سی صورت بنا کر پوچھا

"چلو!" اور ہم نے نازش چنگیزی کے ساتھ پکچر دیکھی۔ چائینیز میں کھانا کھایا لیکن سچ پوچھئے تو دل کی اداسی پھر بھی کم نہیں ہوئی۔

ہم پر اداسی کا دورہ بدستور ہے اور ایک ہم پر ہی کیا منحصر، بیشتر نوجوان اکثر اداس رہتے ہیں۔ انہیں زندگی بڑی بے معنی سی نظر آتی ہے۔ ان کے حصے میں صرف اداسی آئی ہے، البتہ اگر اداسیوں کے اس ہجوم میں کوئی انہیں پکچر چلنے کی، لنچ کرنے کی، پکنک منانے کی دعوت دے تو وہ اُسے قبول کر لیتے ہیں لیکن اُداسی اُن کے دل سے پھر بھی نہیں جاتی۔

آپ یقین مانیں، ہمارے دل سے اداسی کبھی رخصت نہیں ہوتی۔ نہ جانے کیوں؟

(۴ نومبر ۱۹۸۱ء)

ایک بے مقصد دِن

کیا آدمی کو افسوس کرنا چاہئیے اگر اس کی زندگی کا ایک دِن ضائع ہو جائے صِرف ایک دِن۔ میری زندگی کا ایک دِن ضائع ہو گیا۔ میں نے اس دِن کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس کے حوالے سے میں اسے مستقبل میں یاد رکھ سکوں اور اس طرح یہ دِن میری زندگی سے یوں نکل گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ میں دِن چڑھے سو کر اٹھا، سورج نے میرا استقبال خوش دِلی سے کیا۔ میں نے بھی اُسے دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا اور سیڑھیاں اترتا ہوا ناشتے کی میز پر آ بیٹھا، میز پر کہیں سے اُڑ کر آئی ہوئی گوریا پہلے سے بیٹھی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ پھر سے اُڑ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آ گئی اور یوں ناشتے کے اختتام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ تعطیل کے روز اخبار پڑھنا فضول سی بات ہے۔ اس لئے ہاکر انھیں جہاں ڈال گیا تھا" وہ وہیں پڑے رہے"، یعنی کھڑکی کے عین نیچے۔ دھوپ خوشگوار تھی۔ ایک کرسی دھوپ میں پڑی تھی۔ چیزوں کو یوں ضائع جاتے دیکھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے میں دھوپ میں آ گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پڑے پڑے بور ہو رہی تھی۔ استعمال میں آ گئی، کرسی بھی خوش ہوئی۔ میں بھی خوش ہو گیا زندگی خوشی کی طلب کے سوا اور ہے ہی کیا، لیکن تعطیل کا ایک دِن صرف دھوپ میں گزارنا' اور وہ بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، آنکھیں نیم وا کئے بیوقوفی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ" ایک دوست کو ضروری پیغام بھی دینا ہے۔ میں نے گھر والوں سے کہا کہ" میں جا رہا ہوں"۔ انہوں نے جواب دیا۔" تم بھول رہے ہو کہ آج تمہاری تعطیل ہے"۔ ان کا یہ جواب مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا۔ اگر وہ یہ کہتے کہ" ضرور جاؤ کہ ہر شخص جانے ہی کیلئے آیا ہے" تو شاید

مجھے اور زیادہ بُرا محسوس ہوتا۔
گھر سے باہر بہت سے لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے، بچے کھیل رہے تھے گائیں چر رہی تھیں، لڑکیاں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔
مکانات اپنی اپنی جگہ پر ثابت قدمی سے جمے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا، مگر اچھا تھا، میں ان کے درمیان سے گزر رہا تھا کیونکہ مجھے اُن کے درمیان سے گزرنے کی آزادی حاصل تھی اور یہ سارا منظر میں دیکھ بھی رہا تھا بلکہ جس چیز کو بھی دیکھنے کو میرا جی چاہتا تھا' میں ضرور دیکھتا تھا۔ اس لئے کہ میرے دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ملک کے قانون میں میرے حقوق کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ جس دوست کو ضروری پیغام دینا تھا۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پھر دستک دی' پھر بھی خاموشی رہی۔ میں مایوس نہیں ہوا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ گھر میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ اگر گھر کے سب لوگ کہیں گئے ہوتے تو گھر پر ضرور تالا لگا ہوتا۔ مکان باہر سے مقفل نہ ہو تو یہ تصوّر ہی حماقت ہے کہ مکان اندر سے خالی ہوگا۔ تیسری دستک پر میری امیدوں کے عین مطابق دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپنے دوست کا نام لیکر پوچھا کہ کیا وہ موجود ہے۔ بتایا گیا کہ وہ چھت پر ٹیلیویژن کا انٹینا درست کر رہا ہے۔ میں چھت پر پہنچا تو وہ واقعی انٹینا درست کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے دن کا پہلا سچ سُنا لیکن کیا یہ سچ تھا یا محض ایک درست اطلاع؟..... خیر کچھ بھی تھا' میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ "تم کیا کر رہے ہو؟" میرا سوال اصولی اعتبار سے درست نہ تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اینٹنا درست کر رہا ہے۔ میرے دوست نے آرام سے جواب دیا۔
"میں اینٹنا درست کر رہا ہوں۔"
"تمہارا اینٹنا بہت بڑا ہے' اسے چھوٹا کر لو۔"
"یہ پہلے چھوٹا ہی تھا' میں نے اسے بڑا کیا ہے۔"
"لیکن کس لئے۔"؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"عمّان اسٹیشن پکڑنے کیلئے"۔
حکومت رشوت خوروں، ڈاکوؤں اور الذوالفقار کے تخریب کاروں کو پکڑنا چاہ رہی ہے اور تم عمان اسٹیشن پکڑنے میں لگے ہو، آخر کیوں؟"
"بھارتی فلمیں دیکھنے کیلئے؟"
"حکومت صحیح کام کر رہی ہے یا تم صحیح کام کر رہے ہو"۔
"ہم اپنا اپنا کام کر رہے ہیں"۔ میرے دوست نے بے فکری سے کہا۔ یہ جواب مجھے بہت ہی پسند آیا۔ میں اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گیا اور یونہی اینٹنا کو چھونے لگا دوست نے کہا "اسے مت چھوؤ"۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ بعض دوستوں کی عجیب عادت ہوتی ہے۔ اپنی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے اور دوست بھی ہوتے ہیں۔
میں نے اس سے کہا۔" اچھا میں نے تمہیں پیغام پہنچا دیا۔ اب مجھے جانے دو"۔ اس نے تکلفاً کہا۔ "چائے پیتے جاؤ"۔ میں نے بھی تکلفاً جواب دیا۔" شکریہ بہت بہت میں چائے پی کر آیا ہوں"۔ حالانکہ میں نے چائے نہیں پی تھی۔ اس نے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید وہ مجھے چائے پلانے میں دلچسپی ہی نہ رکھتا ہو۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ ظاہر ہے کہ میں وہاں مستقل رہنے کیلئے تو گیا نہیں تھا۔ واپسی پر میں سوچتا رہا کہ ابھی دن خاصا پڑا ہے اور کوئی نہ کوئی معقول کام تو کرنا ہی چاہیئے۔ بہت سوچا، سوچتا ہی رہا۔ تب سمجھ میں آیا کہ سوچنا بھی تو ایک اہم کام ہے لیکن کیا سوچا جائے گھر پہنچ کر، دروازے کے سامنے، میں تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ یونہی کوئی خاص مقصد نہیں تھا پھر دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو گیا کیونکہ گھر میں داخل ہونے کا مروجہ طریقہ یہی ہے۔ گھر میں پانچ کمرے ہیں۔ میں چار کمروں کے فرش پر ٹہلتا رہا۔ پانچویں کمرے میں ٹہلنا اس لئے فضول تھا کہ چار کمروں میں ٹہل ٹہل کر مجھے کون سا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ دوپہر کا کھانا نہ کھانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صبح کے بعد شام ہو گئی ہو۔ کھانے کے بعد قیلولے کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا قیلولے کے دوران عجیب خیال آیا کہ اگر لیٹنا ایجاد نہ ہوتا تو کھڑے کھڑے سونے میں انسان

کو کتنی دشواری ہوتی۔ اس طرح کے خیالات میں کھوئے کھوئے مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ دن گزر گیا تھا۔ "زندگی برف کی طرح پگھل رہی ہے، کیا تجھے احساس ہے۔؟"

(۲۵ فروری ۸۲ء)

دیو کا قہقہہ

میراتھن ریس میں غیر معمولی طور پر بھاری بھرکم رنرز نے ذاتی وجوہ کی بنا پر حصہ لینے سے گریز کیا۔ البتہ اخباری رپورٹ کے مطابق بلدیہ کراچی کے سابق کونسلر جو کونسلروں کے پہلوان کہلاتے ہیں۔ ریس دیکھنے کیلئے صبح سویرے آ گئے تھے۔ ان کونسلر صاحب نے بھی ریس میں زیادتی صحت کی وجہ سے حصہ نہیں لیا۔ چلتے چلتے اُن کی زیادتی صحت کا ایک قصہ سُن لیجئے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک میں پولیس کے جوان انہیں گرفتار کرنے کیلئے اُن کے گھر پہنچے۔ آپ باہر نکلے اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟"

پولیس کے جوانوں نے کہا۔ "آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں"۔

موصوف نے فرمایا۔ "میں تو تمہارے ساتھ نہیں جاتا، ہاں اگر تم مجھے اُٹھا کر لیجا سکتے ہو تو لے جاؤ"۔

پولیس کے جوانوں نے اجازت ملنے پر انہیں اٹھا کر گاڑی میں لادنے کی مقدور بھر کوشش کی اور مایوس ہو کر پسینے پونچھتے ہوئے چلے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر آپ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پردہ اٹھا کر مکان کے اندر چلے گئے۔ قہقہہ لگانے سے یہ ہوا کہ محلے میں بھونچال آ گیا اور کئی خستہ حال مکان گر پڑے۔

(۳۰، جنوری ۸۴ء)

خوش آمدید ۸۳ء

"میں آجاؤں" ؟ ۸۳ء نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اب تک گئے نہیں" میں نے حیرت سے ۸۲ء کا چہرہ تکتے ہوئے سوال کیا۔

"جا ہی تو رہا تھا، سوچا تمہیں الوداع کہہ دوں"۔

"بہت خوب! اندر آجائیے" اجازت ملنے پر وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کا لباس قیدیوں جیسا تھا اور قمیص کے سینے پر ۸۲ء کا ہندسہ مٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بیساکھی میز سے ٹکائی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ آپ کی ٹانگ کو کیا ہوگیا ؟ جب آپ آئے تھے تو یہ ٹھیک ٹھاک تھی"۔

"بیروت کے حادثے میں ضائع ہوگئی"۔ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ "میں وہیں ایک کیمپ میں تھا کہ اچانک .... خیر ہٹاؤ اس موضوع کو....."

"آپ چائے پئیں گے ؟" میں نے ہمدردی سے آفر کی۔

"ہاں.... اگر جلد مل جائے تو...."

"میں نے گھنٹی بجائی۔" اچانک میری نگاہ اس کے ہاتھ پر چلی گئی۔ ہاتھ کا پنجہ کٹا ہوا تھا میں خوفزدہ ہوگیا... "یہ کیا ؟"

"یہ ہرات کی نشانی ہے۔ روسی فوجیوں کا تحفہ"۔ ۸۲ء نے کرب سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اُف میرے خدا! اس کا مطلب ہے تمہیں بہت صعوبتیں اٹھانی پڑی ہیں"۔

"ہاں مگر ایسی کچھ زیادہ بھی نہیں۔ میں تو اُن لوگوں کے متعلق سوچتا ہوں جنھیں

جانے کب تک اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے"۔ اس نے کمال اطمینان سے کہا۔

"اب تمہارا اس دنیا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یعنی تم اس کے مستقبل سے کیا توقعات وابستہ کرتے ہو؟" میں نے براہِ راست سوال کیا۔

"میں پیشین گوئی تو نہیں کر سکتا لیکن بسا اوقات یہ سوچ کر ضرور حیران ہوتا ہوں کہ یہ چل کیسے رہی ہے؟ یہ اب تک باقی کیونکر ہے؟ ہر طرف دھاندلی ہے، ظلم ہے زیادتی ہے، ناانصافی ہے..... میں تو تھک ہی گیا، یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے۔"

"خیر! اب ایسا بھی نہیں ہے، دیکھو میں یہاں کتنے مزے میں بیٹھا کام کر رہا ہوں، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے"۔ میں نے اختلافِ رائے کیا۔

"تمہیں پریشانی نہ ہونے کی"۔ اس نے کہا۔ "وجہ یہ ہے کہ تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے، تم لاعلم ہو، تمہیں خبر نہیں کہ دنیا میں اس وقت کہاں کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یقین مانو! اگر ان سارے مناظر کی تصویریں لا کر تمہیں دکھا دی جائیں تو ذہن ماؤف ہو جائے گا"۔

"کیا واقعی یونہی ہے"؟

"سو فیصد۔ میں مذاق تھوڑے ہی کر رہا ہوں"۔ ۸۲ء نے اپنی بیساکھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تیقن سے کہا۔

"اچھا، یہ چائے لیں"۔ میں نے پیالی اس کی طرف سرکائی۔ اس نے جلدی سے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ میں اسے چائے پیتے ہوئے غور سے دیکھنے لگا۔ افسردہ ملول اور تھکا ہوا ۸۲ء۔

"ہماری دنیا میں تمہیں کوئی چیز اچھی بھی لگی؟ یا یہاں سب کچھ گڑبڑ ہے"۔

"یہاں بے تحاشہ چیزیں اچھی ہیں۔ اس نے پیالی میز پر رکھی۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، بھولی بھالی لڑکیاں، حساس، نیک فطرت شاعر، رحمدل مائیں، ایماندار تاجر، اور پھر مناظرِ فطرت..... لیکن ان کا ریشو کم ہوتا جا رہا ہے۔ شہروں کے بچے نالائق، شہروں کی لڑکیاں عیار، شاعر بدطینت ہو گئے ہیں۔ دنیا کے دیہات اور گاؤں اب بھی

اچھے ہیں۔"

"کیا بات ہے تم اتنے قنوطی کیوں ہو؟"

"میں قنوطی تھا نہیں، یہاں آکر ہو گیا ہوں۔"

"بہرحال تمہیں زندگی کے نشاطیہ پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔"

"اب میرے لئے یہاں دھرا ہی کیا ہے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر میں قنوطی ہو جاؤں یا رجائی!" اس نے بے نیازی سے کہا۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔

"مے آئی کم ان سر؟" ایک شوخ سی آواز نے ہم دونوں کو مڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں چوکھٹ پر ایک خوش پوش نوجوان ہاتھ میں چھڑی، سر پر ہیٹ اور سوٹ بوٹ میں ملبوس سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکوڑے موجود تھا۔

"یس کم ان" میں نے اخلاق سے کہا۔ وہ چھڑی گھماتا ہوا سیٹیاں بجاتا قریب آیا جھک کر مصافحہ کیا۔ پھر ۸۲ء کو غور سے دیکھ کر بولا۔ "بہت خوب! تو آپ ہیں جانے والے۔"

"جی آپ کی تعریف"؟ ۸۲ء نے حیرت اور ناگواری سے پوچھا۔

"میں ہوں جناب آپ کا ۱۹۸۳ء"۔ اس نے خاکساری سے گردن جھکا کر کہا۔ اس کی یہ ادا مجھے بیحد اچھی لگی۔ وہ کسی خوشگوار انگریزی فلم کا کردار لگ رہا تھا۔

"مجھے اجازت دیجیئے"! ۸۲ء نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھئے نا!" میں نے اصرار کیا۔

"ہاں ہاں اتنی جلدی بھی کیا ہے" ۸۳ء نے ۸۲ء کو روکنے کی کوشش کی۔

"جی نہیں مجھے ذرا جلد پہنچنا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں یہاں ٹرانسپورٹ کا کتنا مسئلہ ہے۔"

"میں آپ کو اپنی اسپورٹس کار پر چھوڑ آؤں گا۔" ۸۳ء نے اپنی ٹائی کی ناٹ مضبوط کرتے ہوئے مسکرا کر پیشکش کی۔

"خدا تجھے خوش رکھے میرے بھائی، میں خود چلا جاؤں گا!" ۸۲ء نے شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر چل دیا۔ ہم دونوں اُسے تھکے قدموں سے جاتا دیکھ رہے تھے۔ دروازے پر پہنچ کر

وہ مڑا اور ۱۹۸۳ء کو مخاطب کر کے کہنے لگا "میرے بیٹے! میں بھی یہاں لڑیوٹا کر دلا پر آیا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

۱۹۸۳ء نے مسکرا کر ۸۲ء کو جاتے ہوئے دیکھا اور اپنی کنپٹی پر شہادت کی انگلی اس طرح گھمائی جیسے کہہ رہا ہو کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے! میں نے بتایا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بے چارہ دنیا سے بیزار ہو کر گیا ہے۔ ۸۳ء یہ سُن کر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "پاگل ہے! ورنہ اس خوبصورت دنیا سے کون بیزار ہو کر جا سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے رخصت ہوتے وقت تم بھی اتنے ہی قنوطی ہو جاؤ۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو کھلے میدانوں، پارکوں، ساحل کے کناروں پر رقص کروں گا، گاؤں گا، گیت لکھوں گا، یہ دنیا بہت شاندار جگہ ہے، بیحد شاندار، کیا میں رقص کروں؟" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہیٹ مضبوطی سے سر پر جما کر ناچنے لگا۔

"براہِ کرم شائستگی اختیار کرو۔ میں یہ ناچنا گانا پسند نہیں کرتا اور پھر مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔"

"تم سارے کام کرو، لیکن مجھے میرا کام کرنے دو۔ میں بچوں کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بن جاؤں گا۔ جنگ وجدال کی جگہ امن کے پھول کھلاؤں گا۔ نفرت کے بجائے محبت کا پودا اگاؤں گا۔ میں گاؤں گا، میں رقص کروں گا۔" اس کے قدم فرش پر اور تیز ہو گئے۔ ۱۹۸۳ء ناچ رہا تھا، اس کے لبوں پر البیلے گیت تھے اور میں بے معنی نگاہوں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

(یکم جنوری ۸۳ء)

آمنا سامنا

ہمارے ایک دوست ہپّی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی زلفیں طولِ شبِ فراق جتنی دراز کر چکے تھے۔ ایک شام الفنسٹن اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے محسوس کیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ آدمی نڈر تھے، نروس نہ ہوئے۔ تعاقب تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہا۔ بالآخر ایک مقام ایسا آیا کہ تعاقب کرنے والے کا اُن سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سامنا نے جیب سے نکال کر آمنا کو وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور یہ جا وہ جا۔ اب جو وزیٹنگ کارڈ ملاحظہ کرتے ہیں تو لکھا ہے۔

"براہِ کرم رابطہ قائم کیجئے۔ غریب نواز ہیئر کٹنگ سیلون۔"

(۲۵ اپریل ۸۳ء)

سنسر کے جنگل میں

جاسوسی ناول نگار ایچ اقبال نے انجمن جرائد سندھ کی تقریب میں رسائل و جرائد پر عائد سنسر شپ کے متعدد دلچسپ واقعات گوش گزار کئے۔ انھوں نے مقامی سنسر آفس کے بعض سنسر افسران کے تصور فحاشی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہ رسائل کی کاپیوں سے بعض ایسے جملوں اور فقروں کو فحش قرار دے کر انھیں قلم زد کرتے ہیں جو سرے سے فحاشی کے زمرے میں نہیں آتے مثلاً ایک کہانی میں فقرہ تھا کہ "وہ لڑکی گھر سے برہنہ پا نکلی" سنسر افسر نے فقرے میں سے برہنہ کا لفظ حذف کر دیا اسی طرح دوسری کہانی میں ایک ایسے شخص کا ذکر تھا جو اپنا مکان چھوڑتے وقت شدت جذبات سے بے قابو ہو کر دیوار کو الوداعی بوسہ دیتا ہے۔ اس جملے میں سے "بوسے" کا لفظ نکال دیا گیا۔ اے پی این ایس کے صدر مجید نظامی نے جوابی تقریر میں حیرت کا اظہار کیا کہ سنسر افسر نے پہلے فقرے میں لڑکی کا لفظ کیسے باقی رہنے دیا، کیونکہ لڑکی بھی فحش ہوتی ہے۔

اصولاً ہمیں اپنا کالم یہیں ختم کر دینا چاہیئے کہ یہ خبر اپنی جگہ خود ایک مکمل مزاحیہ کالم ہے لیکن محض کالم کی بقیہ جگہ کو پُر کرنے کیلئے ہم اپنے کالم کو تکمیل تک پہنچائیں گے۔ تھوڑے عرصے قبل تک، جب اخبارات پر مکمل سنسر شپ عائد تھی۔ اخبارات کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے صفحات کی کسی جگہ کو بھی سادہ نہ چھوڑیں۔ اداریہ سنسر ہو جائے تو تصویر لگا دیں۔ تصویر نکال دی جائے تو کارٹون چھاپ دیں، کارٹون ناقابلِ اشاعت ہو تو لطیفے ڈال دیں، لطیفے قابلِ اعتراض ہوں تو بیشک صدر یا گورنر

کی تصویر شائع کر دیں۔

اسی زمانے میں ہمارا شاید ہی کوئی کالم سنسر کی زد سے صاف بچ نکلا ہو، کبھی پورے کالم پر قینچی چل جاتی تھی، کبھی آدھے پر اور کبھی صرف چند جملوں اور فقروں پر۔ پورے کالم کے ناخلف نکلنے کی صورت میں اعتراض اور سوال کرنے کی قطعی گنجائش نہ تھی، البتہ ایک آدھ پیراگراف پر سیاہی پھیری جاتی تو ہم پوچھ بیٹھتے یا ٹوک دیتے تھے۔ جس کے جواب میں ہمیں سنسر افسران "اصولِ صحافت" کا درس دینے بیٹھ جاتے تھے اور تب ہمیں اپنے آپ کو گولی مار لینے یا کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نکل جانے کو جی چاہتا تھا۔ ایسے ہی ایک ناخلف کالم میں ہم نے ایک بار لندن کے موسم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ "آج لندن میں موسم خوشگوار ہو گا، ساحلِ سمندر پر انگریز وہسکی پی کر اوندھے پڑے ہوں گے"۔ سنسر افسر نے ان جملوں کو بیدردی سے کاٹ ڈالا۔ ہم نے وجہ دریافت کی تو پیشانی پر بل ڈال کر جواب ملا کہ "شراب کے تذکرے پر پابندی ہے"۔ جھجھکتے جھجھکتے کہا۔ "میرا خیال ہے شراب کے تذکرے پر نہیں شراب پر پابندی ہے"۔ بھنویں سکیڑ کر بولے: "جی نہیں تذکرے پر بھی ہے بلکہ لفظ "شراب" کی اشاعت ہی ممنوع ہے"۔ ہم نے کہا۔ "پھر شعراء کے ان سینکڑوں دواوین کے متعلق کیا خیال ہے جن میں کثرت سے شراب کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ ان شعراء میں تو شکوہ جوابِ شکوہ والے علامہ اقبال اور شاہنامۂ اسلام والے حفیظ جالندھری بھی شامل ہیں"۔

سنسر آفیسر شانے اچکا کر بولے: "ان لوگوں کے بارے میں ہمیں فی الحال کوئی "ایڈوائس" موصول نہیں ہوئی ہے"۔ اس جواب سے مطمئن نہ ہو کر ہم نے دوبارہ اصرار کیا کہ مذکورہ جملے حذف نہ کئے جائیں لیکن اس پُر زور اصرار کے نتیجے میں افسرِ مذکور مزید شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے کہ ہو نہ ہو ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ خیر انہوں نے اتنا کرم کیا کہ ہمیں اپنے سے بڑے سنسر افسر کے سپرد کر دیا۔ یہ غنوی صاحب تھے، ملک کے مشہور و معروف سنسر افسر۔ ہم نے ان کے سامنے اپنا کیس پیش کرتے ہوئے کہا "بھلا بتایئے صاحب! ان جملوں میں کیا فحاشی ہے کہ "آج لندن کا موسم خوشگوار ہو گا

ساحلِ سمندر پر انگریز وہسکی پی کر اوندھے پڑے ہوں گے۔"

غنوی صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "یہ قطعی طور پر فحش ہے، ساحلِ سمندر پر انگریز اوندھے پڑے ہوں گے۔ یہ سراسر فحش ہے۔" ہم نے احتجاج کیا۔ "لیکن یہ تو لندن کے لوگوں کا معمول ہے۔" "ہرگز نہیں"۔ انہوں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "یہ جملے ہرگز نہیں چھپ سکتے۔ آپ اس جملے کو یوں بھی لکھ سکتے ہیں۔" آج لندن کا موسم خوشگوار ہو گا۔ ساحلِ سمندر پر انگریز استراحت فرما رہے ہوں گے یا قیلولہ کر رہے ہوں گے۔"

"جنابِ! آپ مجھے لکھنے کا سلیقہ نہ سکھائیں۔"

ہمارا گستاخانہ جواب انہیں پسند نہیں آیا اور مذکورہ جملے تو شاید سرکاری ہدایت کے تحت حذف کیے گئے جبکہ بقیہ پیراگراف ہماری بدتمیزی کے ردِ عمل کے طور پر کاٹ دیا گیا۔ ہمیں اندازہ ہے کہ اس کالم کو پڑھ کر متعلقہ محکمے کے سنسر افسران ہاتھ ملتے ہوئے کہیں گے۔ "کبھی کے دِن بڑے اور کبھی کی راتیں"۔ اور وہ ایسا غلط بھی نہیں کہیں گے کیونکہ ہمارے یہاں اب تک راتیں ہی بڑی ہوتی ہیں۔

(۲۳ر جنوری ۸۳ء)

مُدیر کے شکنجے میں

لاہور کے صحافتی حلقوں میں آجکل وہاں سے شائع ہونے والے نئے اخبار کے مالکان کا رویّہ خصوصی طور پر زیرِ بحث رہتا ہے۔ ایک دلچسپ لطیفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی اخبار کے ایک معروف کالم نگار اپنی سابقہ عادت کے مطابق کالم گھر سے ہی لکھ کر بھجوا دیتے تھے۔ اس کا علم جب اخبار کے سیاہ و سفید کے مالک کو ہوا تو انہوں نے مذکورہ کالم نگار کو دفتر طلب کیا، اور دریافت کیا کہ آپ کالم گھر سے ہی لکھ کر کیوں بھجواتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں کالم گھر پر ہی لکھ لیتا ہوں، اس لئے بھجوا دیتا ہوں، حکم مِلا کہ جی نہیں، آئندہ سے آپ کالم گھر سے ہی لکھ کر لایا کریں گے اور ڈیوٹی کے مطابق آٹھ گھنٹے تک دفتر میں موجود رہیں گے۔ کالم نگار نے دریافت کیا۔ صاحب آٹھ گھنٹے تک دفتر میں کیا کروں گا؟ جواب آیا۔ "اپنے کالم کو امپروو (IMPROVE) کرتے رہیئے گا"۔

(۱۲ر مارچ ۸۲ء)

مگر یہ بس کب آئیگی؟

موٹر سائیکل بیچنے کے بعد، اگلی صبح دفتر جانے کیلئے میں بس اسٹاپ پر پہنچا وہاں بے پناہ رش تھا۔ دکاندار، سرکاری ملازم، کالج کے لڑکے، اسکول کی طالبات، بیوپاری بے روزگار غرضیکہ سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔ ان میں سے چند ایک مجھے روز ادھر ادھر سے موٹر سائیکل پر "زن" سے گزرتا ہوا دیکھتے اور پہچانتے تھے۔ لہٰذا توقعات کے عین مطابق وہ مجھے دیکھ کر طنز سے مسکرائے۔ اب میں بھی انہی کی طرح پیدل تھا۔ بیس منٹ بعد دور سے ایک منی بس مسافروں کے بوجھ سے بائیں سمت کو جھکی ہوئی آتی دکھائی دی۔ اسٹاپ پر جیسے ہلچل مچ گئی۔ ادھر ادھر بیزاری سے کھڑے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ سمٹنے لگے نزدیک آگئے۔ منی بس کے پہنچنے سے پہلے وہاں اچھا بھلا "حملہ آوروں" کا جتھہ تیار ہو چکا تھا۔ چند ایک جیالے آگے بڑھنے لگے تاکہ لوٹ پڑیں۔ منی بس قریب آئی، آئی گئی، لوگ تیزی سے لپکے لیکن وہ رکے بغیر زناٹے سے نکل گئی۔ آگے بڑھنے والے جیالوں نے تھوڑی دور تک بھاگ کر پیچھا بھی کیا کہ مبادا وہ آگے جاکر رکے لیکن انہیں جھینپی سی ہنسی ہنس کر دوبارہ اپنی جگہوں پر لوٹ آنا پڑا۔ سنسان سڑک پر اب ۲۰ منٹ سے پہلے کسی بس یا منی بس کے آنے کی توقع بے سود تھی۔ آس پاس کھڑے رکشے اور ٹیکسیاں مسافروں کو للچا رہی تھیں لیکن خواہش رکھنے کے باوجود اسے افورڈ کرنے کی کسی میں استطاعت نہ تھی دھوپ کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ درخت کے نیچے موچی سر جھکائے جوتے پر سول چڑھانے میں جتا تھا۔ میں بور ہو کر کتاب پڑھنے لگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ منی بس کے انتظار میں کوفت اٹھانی پڑے گی۔ اس لئے میں کتاب گھر سے لیکر چلا تھا۔ میرے ساتھ جو

صاحب پتھریلے چبوترے پر براجمان تھے۔ نہایت اپنائیت سے "کمبائنڈ اسٹڈی" کرنے لگے۔

مجھے سخت الجھن ہوئی، میں نے جھنجھلا کر کتاب بند کر دی۔ پتہ نہیں کتاب دیکھتے ہی لوگوں کے اندر مطالعے کا شوق یکدم کیوں بیدار ہو جاتا ہے؟

کے ٹی سی کی دیوہیکل بس، پرانے زمانے کے کسی دیوقامت جانور کی طرح بگٹٹ بھاگتی ہوئی آئی اور زوردار جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ بس کی روٹ کے مسافر سوار ہونے کے لئے زبردست دھکم پیل کرنے لگے۔ اترنے والوں میں سے کوئی چیخ رہا تھا۔ "پہلے ہمیں اترنے تو دو"۔ لیکن اس آواز کو سازشی آواز جان کر کسی نے اس پر کان نہ دھرا۔ انہیں شبہ تھا کہ اترنے والوں کو اترنے کا موقع دیا گیا تو بس چل پڑے گی اور وہ نیچے رہ جائیں گے یا سوار ہو بھی گئے تو اندر جو چند ایک نشستیں خالی پڑی ہیں، ان پر قبضہ ہو جائیگا۔

ایک بوڑھا آدمی جو ابھی ابھی اسٹاپ پر پہنچا تھا مجھ سے پوچھنے لگا۔

"یہ بس لیمارکیٹ جائے گی؟" مجھے واقعی نہیں معلوم تھا۔ ڈھائی سال قبل اس روٹ نمبر کی بس سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

"ٹھہریئے! ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں"۔ جملہ مکمل ہوا بھی نہ تھا کہ بس چل پڑی۔ بوڑھا میرا اور میں بوڑھے کا منہ تکنے لگا۔

"کوئی بات نہیں ہے بابا، اور بس آجائے گی"۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"میری زندگی میں تو آجائے گی نا!"۔ بوڑھے نے دلچسپ انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں! آپ اپنی آنکھوں سے اسے آتا ہوا دیکھیں گے"۔!

"آتا ہوا یا گزرتا ہوا... ہیں!" وہ ہنسا۔ "میں اسے صرف گزرتا ہوا دیکھوں گا"۔

اب میں حساب لگانے لگا کہ من حیث القوم ہم بس اسٹاپوں پر کتنا وقت ضائع کرتے ہیں؟ میں نے سرسری سا اندازہ لگایا کہ کراچی کا ایک پیدل شہری اپنی اوسطاً ۵۰ سالہ زندگی میں کم و بیش دس برس صرف بسوں کے انتظار میں گزار دیتا ہے۔ جس کا اسے کوئی صلہ کوئی ریٹرن نہیں ملتا۔ سوائے صاحب کی جھاڑ کے۔ کلاس کے ناغے کے،

کاروبار کے نقصان یا بیزاری اور کوفت کے۔

میرے روٹ کی منی بس مسافروں سے لدی پھندی جھومتی جھامتی چلی آرہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی پسینے چھوٹ گئے۔ دفتر پہنچنا ضروری تھا۔ اس لئے آستینیں چڑھائیں کتاب قمیض کے اندر رکھی اور جونہی منی بس نزدیک آئی۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی کی طرح تین مسافروں کو ڈاج دیکر دروازے کے اندر گھستا چلا گیا۔

"آرام سے، آرام سے"۔ کوئی چیخ رہا تھا۔ اندر پہلے ہی تین چار معززین شہر مرغا بنے ہوئے تھے۔

"کنڈیکٹر! جب جگہ نہیں ہوتی تو بٹھاتے کیوں ہو؟" مونچھوں والے صاحب نے طوفانِ بدتمیزی پر ردِ عمل ظاہر کیا۔

"کنڈیکٹر تو بٹھائے گا۔ یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ جگہ نہ ہو تو سوار ہونے کی کوشش نہ کریں"۔ دوسرے صاحب نے تلخی سے تبصرہ کیا اور یہ تبصرہ کم اور ہمارے اوپر چوٹ زیادہ تھی۔ ہر دو حضرات پچھلی نشست پر مزے سے بیٹھے تھے۔

"ہمیں مرغا بننے کا شوق نہیں ہے۔ ایک گھنٹے سے اسٹاپ پر کھڑے سوکھ رہے تھے، مجبوراً سوار ہوئے ہیں"۔ مرغا بنے ہوئے ایک معزز شخص نے جو کچھ عجب نہیں کہ کسی کالج کا لیکچرار رہا ہو' بے چارگی سے کہا اور پھر ایک زوردار بحث چھڑ گئی کہ آیا اس طوفانِ بدتمیزی کی ذمہ داری مسافروں پر عائد ہوتی ہے یا کنڈیکٹروں پر۔

موٹر سائیکل خریدنے سے پہلے جب میں باقاعدگی سے منی بسوں پر سفر کرتا تھا۔ اس نوعیت کی بحثیں سننے کا نہ صرف عادی تھا بلکہ نہایت گرم جوشی سے اس میں حصہ بھی لیتا تھا لہٰذا یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ڈھائی سال کے بعد بھی یہ بحث جاری ہے اور اب تک تصفیہ نہیں ہو سکا ہے۔

ان دنوں کا ایک اور تجربہ بھی یاد ہے کہ جب تک میں منی بس میں اکڑوں حالت میں جھکا رہتا تھا۔ مجھے نشستوں پر بے نیازی سے تشریف فرما لوگ سخت بدتمیز اور بد اخلاق محسوس ہوتے تھے جو اخلاقاً بھی کھڑے ہوؤں کو اپنی نشست پیش کرنا پسند نہیں کرتے،

لیکن جب خود مجھے بیٹھنے کا موقع ملا تو منی بس کے اندر مرغا بنے ہوئے لوگ سخت بیوقوف اور جلد باز دکھائی دیتے۔ جن میں صبر کا ذرہ برابر بھی مادہ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ خود اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شہری ہمیشہ کی طرح اب بھی بس اسٹاپوں پر کھڑے سوکھتے رہتے ہیں۔ منی بسوں پر مرغا بنتے ہیں۔ جھگڑتے اور بحثتے ہیں۔ میں تو موٹر سائیکل پر بیٹھنے کے بعد ان مسائل کو بھول گیا تھا جیسے اس ملک کے حکمران اور بیوروکریٹس شاندار گاڑیوں میں بیٹھ کر سمجھتے ہیں کہ ملک کا ہر شخص ان ہی کی طرح آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(۳، مئی ۸۳ء)

تیل نکل آیا

غریب آباد سے تیل نکلنے کی خبر سن کر سارے دوستوں نے ہپ ہپ ہرّہ کے نعرے لگائے۔ بغلول کہنے لگے۔ "اب مزہ آئے گا۔"

مخولی نے پوچھا: "کس بات کا مزہ"

"تیل کا مزہ اور تیل کی دھار کا مزہ۔ اب ہمارا بھی شمار تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ہونے لگے گا اور مخولی آج سے تم مخولی نہیں بلکہ شیخ مخولی کہلاؤ گے۔"

شیخ مخولی نے یہ سُن کر اپنا کنتورہ درست کیا اور بے نیازی سے بولا۔ "رات کافی گزر چکی ہے، اگر ہیگ کا فون آئے تو کہہ دینا ہم آرام کر رہے ہیں۔"

"کون ہیگ؟" عارف نے حیرت سے پوچھا۔

"امریکی وزیرِ خارجہ۔" شیخ مخولی نے آرام سے کہا۔

"تو کیا تم واقعی شیخ بن گئے؟"

"اور کیا! تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو، اب دیکھنا ہم دنیا میں کیسا تہلکہ مچاتیں گے۔ قرضے پر بہت دن گزارہ کر لیا۔" بغلول کچھ جذباتی ہو گئے۔

"بغلول بھائی ذرا پتہ کیجئے گا کہ ہم کن ممالک کے مقروض ہیں۔ ان کی فہرست مرتب کر کے ہمارے وزیرِ خزانہ کو دے دیجئے۔ انشاءاللہ آئندہ ہفتے سے ہمارا شمار بھی دنیا کے باوقار ممالک میں ہونے لگے گا۔ یہ نک چڑھے یورپی جو گداگر اقوام کو تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، انہیں بھی تو پتہ چلے کہ غریب آباد سے تیل نکلنا کوئی ایسا ویسا معمولی واقعہ نہیں ہے۔"

"اچھا اب زیادہ بور مت کرو۔ یہ بتاؤ سلطان آیا تھا؟" عارف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کون سلطان؟"۔ شیخ مخولی مجسّم سوال بن گئے۔

"وہ اپنا سلطان، کہاں ہے بھول گئے؟"

"اچھا، وہ لیکچرار!"۔ شیخ مخولی نے مذاق اُڑایا۔

"بھئی عارف اب تم ہم سے لیکچرار وغیرہ کی باتیں نہ کیا کرو"۔ عارف نے مخولی کو بونگیاں مارتے دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ بغلول نے اسے تسلّی دی۔ "عارف بیٹے! نئی نئی بات ہے، اس لئے ہمیں یقین نہیں آرہا ہے، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ہاں ہاں اور کیا"۔ موٹے نے بغلول کی حمایت کی۔ "عارف ہوسکتا ہے ہم اوپیک کے اجلاس میں نمائندگی کیلئے تمہیں ہی بھیج دیں۔ تم ایسا کرو کہ تیل کی پیداوار اور دنیا میں اس کی مارکیٹ وغیرہ کے بارے میں معلومات جمع کرنا شروع کردو۔"

"تم لوگ تو ہوگئے ہو پاگل"۔ عارف نے جھنجھلا کر کہا۔ "کس احمق نے کہا ہے کہ غریب آباد سے تیل نکل آیا ہے، وہاں سے جو تیل رس رہا ہے، وہ قریب کے پٹرول پمپ کا ہے۔"

"یہ اندازِ فکر بھی درست ہے"۔ موٹا بولا۔ "عوام میں اور پڑوس کے ممالک میں یہی تاثر ہونا چاہیئے، ورنہ ملک کو خطرات درپیش ہوسکتے ہیں خصوصاً آغا شاہی اور نرسمہا راؤ کے مذاکرات پر اس کے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔"

"تم لوگ تو احمقوں کی جنّت میں رہتے رہتے بالکل احمق ہوچکے ہو"۔ عارف پھر چلّایا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں کہ ہم اپنے نوزائیدہ تیل کے کنوئیں پر چلتے ہیں تاکہ عارف خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور اسے یقین آجائے۔"

"لیکن اتنی رات گئے"۔؟ کسی نے تجویز پر اعتراض کیا۔

"بیٹے! قوموں کو عظمت تن آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، کیا سمجھے!" بغلول کی اس نصیحت کو سب نے بیحد سراہا اور اسے اپنی گرہ میں مضبوطی سے باندھ لیا اور گھر کے کسی کونے میں پڑے ہوئے پرانے زنگ آلود ٹارچ کو اٹھایا اور تیل کے کنوئیں کی جانب بذریعہ کار روانہ ہوئے۔

تیل کے کنوئیں پر پہنچ کر رات اور زیادہ گہری ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود علاقہ کے غریب مگر حوصلہ مند عوام کنوئیں پر جمع تھے اور ایک مدقوق سا سپاہی کندھے پر بندوق لٹکائے انہیں بار بار پیچھے ہٹنے کے احکامات جاری کر رہا تھا۔ شیخ مخولی کا سپاہی کو دیکھتے ہی پارہ چڑھ گیا اور وہ اُسے بُرا بھلا کہنے لگ گیا کہ یہ کم بخت بیچ میں کہاں سے آگیا اور یہ ہوتا کون ہے تیل کے معاملات میں دخل دینے والا۔ اُسے بڑی مشکل سے سمجھایا گیا کہ غیر ملکی ایجنٹوں سے کنوئیں کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہ کسی وقت بھی دھماکہ سے اس تیل کے کنوئیں کو اڑا سکتے ہیں۔ اس وضاحت پر شیخ مخولی مطمئن ہوگیا۔ نہ صرف مطمئن ہوا بلکہ اس نے جاکر سپاہی سے نہایت باوقار طریقے سے ہاتھ ملایا اس کا حال پوچھا اور اُسے اس کی فرائض کی انجام دہی کے لئے ضروری ہدایات بھی دیں۔ عوام بیحد خوش تھے۔ ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "فیض بخش! اب اس علاقے کا نام غریب آباد سے امیر آباد ہو جائے گا۔ ادھر کے سب لوگ امیر ہو جائیں گے۔"

"اور کیا! ادھر وڈی وڈی بلڈنگاں کھڑی ہوں گی"۔ فیض بخش نے تائید کی۔

بغلول نے اندھیرے کنوئیں میں ٹارچ کی روشنی پھینک کر شیخ مخولی اور عارف کو تہہ میں جمع شدہ تیل دکھایا۔ عارف طنز سے بولا۔ "بس اتنا سا تیل!"

شیخ مخولی یہ سُن کر اٹھ گیا اور تقریباً چیخ کر کہنے لگا۔ "ہاں ہاں بس اتنا ہی سا تیل ہم اتنے ہی تیل سے ساری دنیا کے باجے بجا دیں گے، اور ہم آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور آپ جیسے گھاس پھوس والے ممالک کے باشندوں کو ویزے بھی نہیں دیں گے۔ ہم مشرق وسطےٰ سے اپنے سارے بھائیوں کو واپس بلالیں گے، ہم امریکہ کو تیل بند کر دیں گے، ہم صرف چین کو تیل دیں گے، چین ہمارا دوست ہے۔ ہم دنیا کے کونے کونے میں پاکستان کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔ تیل عظیم قوت ہے۔ پاکستان عظیم ملک ہے۔"

وہ جوش میں جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا اور سپاہی نے اس کی جوشیلی تقریر سن کر گھبرا کر اپنے کندھے سے بندوق اتار لی لیکن پھر قریب آکر بغلول کو حیرت سے تکنے لگا۔

(۴ فروری ۱۹۸۱ء)

زیرِ تکمیل فلم کا ایک منظر

"گڈ، ویری گڈ"۔ تم سب کی پرفارمنس بیحد شاندار ہے"۔ لمبے قد والے ڈاکو نے گود میں بیٹھی ہوئی کالی بلّی کی پشت کو سہلاتے ہوئے خونخوار لہجے میں اپنے ساتھیوں کو شاباش دی جو ابھی ابھی کامیاب ڈاکے کے بعد لوٹے تھے۔ وہ اپنے ڈیل ڈول اور رویّے سے ڈاکوؤں کا باس لگتا تھا۔ "کیا پولیس نے تمہارا پیچھا کیا؟" اس نے سیاہ چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"باس! کیا پولیس نے کبھی ہمارا پیچھا بھی کیا ہے"؟ ایک ڈاکو نے طنز سے ہنس کر کہا۔

"خاموش! گستاخ" باس دھاڑا۔ "ہماری پولیس پر انگلی اٹھانے کا تجھے کس نے حق دیا ہے"!

"معافی چاہتا ہوں باس"۔ چھوٹے ڈاکو نے گھگھیا کر کہا۔

"ہمیں ہمارے سوال کا جواب دیا جائے۔ کیا پولیس نے تم لوگوں کا پیچھا کیا۔؟"

"باس! پولیس والے پیدل تھے، انہوں نے ہمیں دیکھ کر آنکھیں چرالیں"۔

"ہا ہا ہا"۔ باس نے قہقہہ لگایا۔ "ہماری پولیس پیدل تھی! ہمیں یہ سن کر سخت افسوس ہوا۔ زیرو زیرو سیون۔!"

"یس باس!" پیچھے سے ایک ڈاکو ایڑی بجا کر آگے آیا۔ "زیرو زیرو سیون۔ ہمیں یہ جان کر دکھ ہوا کہ ہمارے تھانوں کے بیشتر سپاہی پیدل گھومتے رہتے ہیں اور ہمارے ساتھیوں کو ڈاکہ مار کر فرار ہوتے دیکھ کر آنکھیں چرا لیتے ہیں اور بعد میں کسی موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لیکر ڈاکے کی اطلاع دینے تھانے تک پہنچتے ہیں۔ یہ شرم کا مقام ہے زیرو زیرو سیون"۔

"جی ہاں باس! واقعی یہ ہمارے لئے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہے میں اکثر سپاہیوں کے جسم پر برسوں کی استعمال شدہ وردیاں دیکھتا ہوں تو میرا سر افسوس سے جھک جاتا ہے۔!"

"سر! چھوٹے ڈاکو نے لقمہ دیا۔" اِن سپاہیوں کی بندوقیں اتنی پرانی اور آؤٹ آف ڈیٹ ہیں کہ چلائے نہیں چلتیں۔ سر! یہ بندوقیں نہیں لاٹھیاں ہیں لاٹھیاں جن سے مویشی ہنکائے جاسکتے ہیں یا کسی جھگڑالو بیوی کو دکھا کر ڈرایا اور اُسے چُپ کرایا جاسکتا ہے۔"

"سر! اِن کی صحتیں بھی خراب ہیں، ان سپاہیوں کو دور سے دیکھئے تو ایسا لگتا ہے کہ ہینگر پر وردیاں جھول رہی ہیں اور سر! ان کی تنخواہیں اتنی کم کیوں ہوتی ہیں؟" طوطے جیسی ناک والے ڈاکو نے فلسفیانہ انداز میں سوال کیا۔

"تمام چھوٹے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں طوطے۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔" اگر تنخواہیں ٹھیک ٹھاک ہوتیں تو ہم ڈاکے کیوں مار رہے ہوتے۔!"

"ہمارے ڈاکہ مارنے کی تو کچھ سیاسی وجوہ بھی ہوں گی نا۔"

"میاؤں" باس کی گود میں بیٹھی ہوئی سیاہ بلّی نے گردن موڑ کر جمائی لی۔

"ہاں تو آج کے ڈاکے کی پوری رُوداد بیان کر دالفانسے!" باس نے ہٹے کٹے ڈاکو کو مخاطب کیا۔

"سر! سڑک سنسان تھی، کیشیئر اور اس کے ساتھی کی کار کے آگے ہم نے اپنی موٹر سائیکل روکی، کار بھی رُک گئی۔ میں نے کہا۔" مسٹر کیشیئر! ہم ڈاکو ہیں۔" کیشیئر نے مسکرا کر جواب دیا۔" آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔" ذرا جلدی سے بریف کیس دیدو" کیشیئر نے پوچھا۔" آپ لوگوں کے پاس پستول بھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔" بالکل ہے" اس نے پوچھا!" پستول میں گولیاں بھی ہیں۔" میں نے کہا۔" وہ بھی ہیں" کیشیئر نے درخواست کی کہ پھر آپ لوگ مجھے پستول کیوں نہیں دکھاتے۔" میں نے کہا۔" موسم اچھا ہے، اتنے اچھے موسم میں پستول دکھانا غیر مہذب سی بات ہے!" کیشیئر خوش اخلاقی سے ہنس پڑا۔ کہنے لگا!" اچھا فقرہ ہے!" میں نے کہا۔" ہمیں فقرے کی داد نہیں بریف کیس چاہیئے۔" کیشیئر بولا۔

"........"

"بکواس بند کرو گستاخ"۔ باس چیخا۔ کیا اس طرح بھی کہیں ڈکیتی ہوتی ہے"۔

"جناب! آجکل اسی طرح ہو رہی ہے"۔ الفانسا روہانسا ہو کر بولا۔

"یہ ڈکیتی نہیں، ڈکیتی کے نام پر مذاق ہے"۔ باس پیر پٹختا ہوا ٹیلیویژن کے اداکار کی طرح تیزی سے کھڑکی کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میاؤں"۔ بلّی نے پھر گہری جمائی لی۔

"سر! بلّی کے دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے"۔ ایک نوعمر زیرِ تربیت ڈاکو نے مداخلت کی۔ وہ باس کی کالی بلّی کو دودھ پلانے کے کام پر مامور تھا۔

"ٹھیک ہے لے جاؤ اسے"۔ باس نے کھڑکی سے دُور افق پر نگاہیں جما کر کہا۔

"سر! ایک بات کہوں؟" الفانسے نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کہو الفانسے" باس غمگین ہو گیا۔

"سر! اس بے مزہ روکھی پھیکی ڈکیتی سے ہم تنگ آچکے ہیں، سر! اب اس کام میں پہلے جیسا تخلیقی لطف نہیں آتا"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو الفانسے، لیکن ہم کیا کریں"۔

"سر! ہم اپنی لوٹی ہوئی دولت میں سے سپاہیوں کو موٹر سائیکلیں، جیپیں اور اچھی اچھی دُور مار بندوقیں دلا دیں تاکہ پولیس سے کچھ تو مقابلہ ہو۔ ڈکیتی کا کچھ تو مزہ آئے"۔

"تمہاری تجویز اچھی ہے الفانسے! ہم اس پر تنہائی میں غور کریں گے"۔ باس نے کہا۔

"سر! اس طرح ہم ڈکیتی کی تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کریں گے۔ اور آپ پھولن دیوی کی طرح مشہور ہو جائیں گے۔!"

"ٹھیک ہے! اس کے بارے میں کل فیصلہ کیا جائے گا۔ فی الحال کل کی ڈکیتی کا پروگرام چاک آؤٹ کرو"۔ باس اتنا کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

(۱۴ ستمبر ۸۲ء)

مِصر کے دیوہیکل

مِصر کے عالمی شہرت یافتہ صحافی جناب حسنین ہیکل نے رہائی کے بعد نہایت شاعرانہ اور خوبصورت بیان دیا ہے۔

انھوں نے کہا :

"رہا ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ دنیا میں پھول اب بھی کھل رہے ہیں، دریائے نیل اب بھی پہلے کی طرح بہہ رہا ہے اور شہر میں روشنیوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر میں بے تاب ہوگیا۔"

پوچھا گیا : "جیل کے دِن اور جیل کی راتیں آپ کو کیسی لگیں ؟"

"میں قید خانے میں زیادہ خوش نہیں تھا۔ سلاخوں کے پیچھے چہرے اچھے نہیں لگتے۔"

انھوں نے سَر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کو وہاں خوف بھی محسوس ہوا۔؟"

"جی ہاں! جیل میں خوف کا بھی بسیرا ہوتا ہے کیونکہ وہاں آدمی باقی دنیا سے کٹ جاتا ہے اور دنیا سے کٹنے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ماضی سے جُدا ہوگیا۔ ماضی سے جُدا ہونا بڑا دردناک ہوتا ہے۔"

"کیا آپ دنیا میں جیل خانوں کی موجودگی کے مخالف ہیں۔؟"

"میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ بہت سے لوگ میرے لئے کسی بھی لمحے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں، جن سے بچنے کیلئے میں انہیں جیل خانے بھجوانے کی سفارش کرسکتا ہوں۔"

"اور آپ خود بھی تو کسی کے لئے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں؟"
"جی ہاں، بالکل! اور شاید اسی لئے مجھے جیل کی ہوا کھانی پڑی"۔
"جناب، جیل کی ہوا اور آزاد دنیا کی ہوا میں کیا فرق ہے۔؟"
"نہایت واضح فرق ہے، ایک ہوا میں آپ آزادی سے سانس لے سکتے ہیں دوسری ہوا میں بھی سانس لیا جا سکتا ہے لیکن پہلے میں آپ کی مرضی شامل ہوتی ہے دوسرے میں نہیں ہوتی"۔
"آدمی کی مرضی کی کیا اہمیت ہے؟"
"کم از کم ہمارے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے"۔
"کیا کہیں اور ہے؟"
"ہوگی! لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ؟"
"مسٹر ہیکل، رہا ہوتے وقت آپ کے تصورات کیا تھے؟"
"میں سوچتا تھا، شاید میری عدم موجودگی کی وجہ سے ماحول پر افسردگی طاری ہوگی زندگی کا مزہ ختم ہو چکا ہوگا"۔
"لیکن پھر آپ نے کیا محسوس کیا؟"
"میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ چاند ہمیشہ کی طرح اہرامِ مصر پر چمک رہا ہے اور معمولاتِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا"۔
"یہ دیکھ کر آپ کو کیسا لگا؟"
"میں نے خود کو بے انتہا چھوٹا، بے بس اور لاچار محسوس کیا کہ حسنین ہیکل جسے دنیا جانتی ہے وہ درحقیقت دنیا پر کوئی اثر نہیں رکھتا۔ وہ دنیا کے عالمگیر نظام کا ایک حقیر سا پرزہ ہے"۔
"اور تب آپ نے کیا کیا؟"
"میرے اہلِ خانہ اور دوست جو میرے استقبال کو آئے تھے، ان سے ملنے کے بعد میں گھر پہنچا، میں نے نیم گرم پانی سے غسل کیا، تولیے سے جسم خشک کیا۔ ہوا میں زور دار

سے ٹھنڈے سانس لئے اور پھر چند فوٹوگرافر آگئے جن کی موجودگی میں میں نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مسرّت بھرے قہقہے لگائے!"

"مسٹر ہیکل، ان لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو ابتک قید ہیں؟"

"براہِ کرم مجھے آرام کا موقع فراہم کریں"۔

"مسٹر ہیکل! آپ کو تو جیل میں خصوصی مراعات حاصل رہی ہوں گی۔ کیا آپ کو وہاں آرام کا موقع نہیں ملا؟"

"جیل.... (رُک کر) مگر میرا خیال ہے اب جیل کے تذکرے کو فراموش کر دینا چاہیئے"

"تو آئیے ہم رہائی اور آزادی کے بارے میں گفتگو کریں۔ جناب! آپ نے رہائی کے بعد نہایت خوبصورت بیان دیا۔ آپ نے کہا کہ میں یہ دیکھ کر بے تاب ہوں کہ دنیا میں پھول اب بھی کھل رہے ہیں....."

"جی ہاں! یہ بیان میرا ہی تھا"۔

"کیا آپ نے رہائی کے بعد یہ نہیں دیکھا کہ دنیا میں ظلم اب بھی موجود ہے، خون اب بھی بہہ رہا ہے اور شہر ناانصافی اور گناہوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں"۔

"یقیناً میں نے یہی دیکھا لیکن میں نے یہ کہا نہیں کیونکہ میں صحافی ہوں، انقلابی نہیں ہوں"۔

"ایک صحافی اور انقلابی میں کیا فرق ہوتا ہے مسٹر ہیکل"۔؟

"صحافی بالعموم سر بچا کر بات کرتا ہے جبکہ انقلابی سر ہتھیلی پر رکھ کر بات کرتا ہے یہی بنیادی فرق ہے"۔

"جن ممالک میں انقلابی موجود نہ ہوں، وہاں صحافیوں کو کیا کرنا چاہیئے۔؟"

"پھر تو سر بچانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے"۔

"اور اگر سر کو پھر بھی خطرہ لاحق رہے تو؟"

"صحافت چھوڑ کر کوئی مفید کاروبار کر لینا چاہیئے"۔

"آپ کیا کریں گے؟"

"میں اپنا بھی سر بچاؤں گا اور اپنے سربراہِ مملکت کا بھی"۔
"پھر تو آپ فائدے ہی فائدے میں رہیں گے؟"
"ایسی ہی صحافت میں فائدہ ہے مسٹر!"
"بے شک مسٹر ہیکل، آپ ایک دیو ہیکل شخصیت کے مالک ہیں"۔
"شکریہ! نوازش!!"۔

(۲، دسمبر ۱۹۸۱ء)

یس مِنسٹر!

"یس منسٹر" میں مسز تھیچر کی اداکاری سے پتہ چلا کہ اچھا سیاستداں اچھا اداکار بھی ہوتا ہے بلکہ اداکار ہی ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ سیاستداں اداکاری ہمیشہ سیاسی مقاصد ہی کیلئے کریں۔ بہت سے کام مقصد کے بغیر بھی کئے جاتے ہیں جیسے لوگ بغیر کسی مقصد کے پیدا ہو جاتے ہیں اور بعد میں زندہ رہنے کا مقصد یا جواز ڈھونڈ لیتے ہیں مسز تھیچر کی اداکاری کا مقصد بھی بعد میں تلاش کر لیا جائے گا۔ فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسٹیج پر اداکاری اپنی دیرینہ خواہش کی وجہ سے کی یا ممکن ہے انہیں بچپن سے اداکارہ بننے کا شوق رہا ہو اور حالات نے انھیں وزیرِ اعظم بننے پر مجبور کر دیا ہو جیسے ہمارے ملک میں چند سال پیشتر بعض افراد وزیر بننے پر مجبور کر دیئے گئے تھے اور جب وہ وزیر بن گئے تھے تو انہیں وزارت سے ہٹانے کیلئے بھی وہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا۔ اسکی وجہ اسکے سوا کچھ اور نہیں کہ سیاست ہو یا اداکاری، بنیادی اہمیت ہمیشہ ہدایتکار کو حاصل ہوتی ہے چونکہ سیاستداں بھی ایک اعتبار سے اداکار ہی ہوتا ہے اسلئے وہ بھی ہدایتکار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتا ہے۔ اداکار کی فلم فلاپ ہو جائے تو اس کا سبب خراب اداکاری یا ہدایتکار کی کمزور ہدایات ہوتی ہیں۔ بعض عاقبت نااندیش ہدایتکار اداکار کی مقبولیت سے تنگ آ کر بھی اسے فلاپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری قومی سیاست میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

(۲۵، جنوری ۱۹۸۴ء)

سیاسی ڈھانچہ اور لقراط

کافی ہاؤس کی میز پر "ب" نے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے "الف" سے کہا :
"مجھے یقین ہے کہ مجوزہ سیاسی ڈھانچے میں فوج کا آئینی کردار متعین ہو جائے گا۔" الف
جو دور سے خود سیاسی ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا' یہ سنتے ہی کرسی سے یک لخت گر پڑا۔ "ب"
نے اشارے سے بیرے کو بلایا۔ "صاحب کو اٹھاؤ"۔

"جی! بیرا بھونچکا رہ گیا۔

"میں کہہ رہا ہوں صاحب کرسی کے نیچے پڑے ہیں' انھیں اٹھاؤ"۔

"ب" نے غصّے سے چیخ کر کہا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے الف کا یوں بغیر کسی
پیشگی نوٹس کے گر پڑنا سخت ناگوار گزر رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ کافی ہاؤس میں موجود لوگوں
نے "الف" کے گرنے کا قطعی نوٹس نہیں لیا۔ شاید کسی نے اُسے گرتے ہوئے دیکھا نہ ہو یا
ممکن ہے باتیں کرتے کرتے کرسی سے گر پڑنا عام سی بات ہو گئی ہو۔ "الف" جب دوبارہ کرسی
پر براجمان ہوا تو کاؤنٹر سے مینیجر بھاگا ہوا آیا۔ اس نے "الف" سے تہ دل سے معذرت کی
اور "ب" سے پوچھا کہ اس نے "الف" کو ایسی کیا ناقابلِ برداشت بات کہہ دی تھی جس کے
بوجھ سے وہ گر پڑا۔

ب نے سادگی سے بتایا کہ وہ سیاسی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا اور سیاسی
ڈھانچے کے متعلق ......" "سیاسی ڈھانچہ" مینیجر نے چیخ ماری اور اُلٹے قدموں سے دوڑتا
ہوا کاؤنٹر کی طرف گیا اور اونچی کرسی پر بیٹھ کر مسکرانے لگا۔ "ب" نے دلچسپی سے مینیجر کو دیکھا
اب مینیجر دیوار پر آویزاں ہدایت کی طرف اشارہ کر رہا تھا: "یہاں سیاسی گفتگو پر بحث کرنا

منع ہے۔"

"یہ جملہ" الف نے کہا۔ (اس کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔)

"یہ جملہ گرامر کی رُو سے غلط ہے"۔

"یور ہائی نس! اس ملک میں درست کونسی چیز ہے"! سفید وردی میں ملبوس بیرے نے ادب سے جُھک کر کہا۔

"ہمارے درمیان مداخلت کرنے کا صرف ایک مطلب ہے"۔ ب نے تلخی سے کہا۔" اور وہ یہ ہے کہ تم وہ کام نہیں کر رہے جو تمہیں سونپا گیا ہے"۔

بیرے کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ ہو گیا۔

"میں کافی ہاؤس کے مفاد میں بولا ہوں"۔ اس نے اپنا دفاع کیا۔

"لال بابو ٹھیک بولتا ہے، لال بابو ٹھیک بولتا ہے"۔ مینیجر کاؤنٹر سے چلایا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"بکواس" ب نے بوریت کا اظہار کیا۔

"ہاں تو تم سیاسی ڈھانچے کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے"۔ الف نے یاد دلایا۔

"میں؟ میں کچھ کہہ رہا تھا کیا؟" ب نے حیرت سے کہا۔

"تم ابھی تھوڑی دیر پہلے سیاسی ڈھانچے میں فوج کے آئینی کردار کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے"۔

"لیکن کب؟ تعجب ہے مجھے بالکل یاد نہیں"۔

"تمہارا حافظہ کمزور ہے۔ میرے کرسی سے گرنے سے قبل تم اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے"۔

"لیکن تم کرسی سے کب گرے تھے"؟ ب سنجیدہ تھا۔

اب کے بیرا قہقہے لگانے لگا۔

"ماچس ہوگی آپ کے پاس"؟ ایک اجنبی نے الف کو مخاطب کیا۔

"کیا ماچس ایجاد ہو چکی ہے؟" ب نے اجنبی سے پوچھا۔

اجنبی بولا۔ "آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔
"مجوزہ سیاسی ڈھانچے کے بارے میں آپ کی کیا پیشگوئی ہے؟" ب نے اجنبی سے سوال کیا۔
"معاف کیجئے مجھے علم نجوم سے قطعی دلچسپی نہیں"۔
"حیرت ہے اس ملک میں کوئی نہیں جانتا کہ سیاسی ڈھانچہ کس قسم کا آنے والا ہے۔ یہ لوگ اتنے بے خبر کیوں ہیں؟" ب نے زور سے کہا۔ اب لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔
"جناب! کافی ہاؤس میں زور سے بولنا آداب کے خلاف ہے"۔ بیرے نے اسے ٹوکا۔
"لال بابو ٹھیک بولتا ہے"۔ مینیجر نے کاؤنٹر سے بولنگ کی۔
"بیرا ایک گلاس ٹھنڈا پانی! اور ہاں مسٹر! ماچس! مجھے افسوس ہے"۔ ب نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔
"بے خبر رہو اور عیش کرو!" اجنبی جاتے جاتے فقرہ اچھال گیا۔
"اس نے کیا کہا؟" ب جیسے خواب میں چونک پڑا۔
"وہ کہتا ہے بے خبر رہو اور عیش کرو"۔ الف نے بتایا۔
"یہ حکومت کا پٹھو ہے!" ب نے تیقن کا اظہار کیا۔
"لیکن حکومت کس کی پٹھو ہے"؟ بیرے نے مسکرا کر پوچھا۔
"یوشٹ اپ!" ب دھاڑا۔
"آرام سے، آرام سے"۔ الف نے تسلی دی۔
"مینیجر" اجنبی اپنی میز سے بولا۔ "ان دونوں کو کافی ہاؤس سے نکال باہر کرو"۔
"ہاں جی آپ لوگ چلیں"۔ مینیجر نے سختی سے کہا اور پھر کاؤنٹر کے نیچے چہرہ چھپا لیا جیسے ہنسی کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
اگلی صبح ماہر نفسیات الف کو بتا رہا تھا کہ مجوزہ سیاسی ڈھانچہ پر سوچ سوچ کر "ب" کے اسکرو ڈھیلے ہو گئے ہیں۔
(۱۱ اگست ۸۳ء)

دی کلینک

کمپونڈر کلینک کے احاطے ہی میں بھاگ بھاگ کر آدھا خرچ ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے میرے ہاتھ میں ٹوکن تھمایا اور دوبارہ مکیچر بنانے میں مصروف ہو گیا۔ امریکہ سے آئے ہوئے ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ امریکہ سمیت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں مکیچر کا رواج ختم ہوئے عرصہ بیت چکا ہے اور یہی بات جب میں نے ایک مقامی ڈاکٹر کی خدمت میں گوش گزار کی تو وہ سخت ناراض ہو گئے اور مجھے ہدایت کی کہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنا علاج امریکہ ہی میں کرائیں لیکن میں امریکہ تو نہ جا سکا۔ البتہ میں نے اپنا معالج تبدیل کر لیا۔ نئے معالج کے کمپونڈر کے تھمائے ہوئے ٹوکن پر ۱۸ کا ہندسہ بڑی مردنی سے درج تھا اور سچ پوچھئے تو کچھ بیمار بیمار سا بھی لگ رہا تھا کلینک کے اندر ایک تنگ اور گھٹن آلود فضا میں کچھ نہیں تو کم از کم ڈیڑھ درجن مریض ہاتھوں میں دواؤں کی شیشیاں لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی برادری میں شامل ہوتے دیکھ کر خوشگوار تاثر قائم نہیں کیا۔ ایک نسبتاً ہمدرد شخص نے ذرا سا سرک کر بیٹھنے کیلئے جگہ خالی کی۔ اتنے ڈھیر سارے مریضوں کو اپنی کلینک میں پا کر یقیناً ڈاکٹر بہت خوش ہوگا۔ میرے دل نے سوچا۔

"آپ کا کون سا نمبر ہے؟" ساتھ کے مریض نے کھانستے ہوئے پوچھا۔ (ڈاکٹر کے نزدیک یہ کھانسی جلترنگ سے کم درجہ نہ رکھتی ہوگی)

"اٹھارہ"

"ابھی دیر ہے"۔ وہ دیوار سے سر ٹیک کر دوبارہ کھانسنے میں مشغول ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب نے چار لاکھ روپے کی نئی کوٹھی خریدی ہے۔ کیا وہ ایک ڈیڑھ لاکھ روپے اس کلینک پر نہیں لگا سکتے تھے۔ کتنی گھٹن ہے یہاں۔" کونے میں بیٹھا ہوا نوجوان بڑبڑایا۔

"حالانکہ ان کی آمدنی اچھی خاصی ہے"۔ دوسرے نے لقمہ دیا۔

"پھر بھی کتنی ہوگی؟"

"پرسوں کمپونڈر بتا رہا تھا کہ روزانہ ایک سے ڈیڑھ ہزار روپے کی آمدنی ہوتی ہے"۔

"کمال ہے یقین نہیں آتا"۔

"ہاں لیکن دوا کیا دیتے ہیں؟ آج تک پیٹنٹ دوا تو ....."

"اٹھارہ نمبر"۔ کمپونڈر دھاڑا۔

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ صحت مند ڈاکٹر صاحب کرسی میں پھنسے بیٹھے تھے۔ سامنے کے بیڈ پر کسی مریض کو خون کی بوتل چڑھائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر بولے۔ "کیا تکلیف ہے"

"جی وہ کل رات بخار آگیا تھا۔ بخار سے پہلے جسم پر خارش سی محسوس ہوئی اور جسم پر دانے سے ابھر آئے اور....." ڈاکٹر نے کانوں پر آلہ لگا لیا۔ "سانس زور سے لیجئے"۔ میں نے تین چار بار سانس زور زور سے کھینچا۔ "اور کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے اپنی سماعت اور میری آواز کے درمیان حائل آلے کی دیوار کو گرائے بغیر دریافت کیا۔

"جناب! اس طرح کی بیماری مجھے ایک آدھ بار بچپن میں ہوئی تھی یا اب جا کر ہوئی ہے۔ خارش محسوس ہونے پر میں نے ایویل ریٹارڈ کی ایک گولی کھائی جس سے مجھے خاصا افاقہ ہوا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر میری بکواس پر کان دھرے بغیر ہی نسخہ لکھنے میں مصروف ہے۔ "جناب! کیا میری آواز آپ تک پہنچ رہی ہے"۔ میں نے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔ کانوں پر آلہ بدستور چسپاں تھا۔ نسخہ لکھنے کے بعد انہوں نے آلہ کو اپنے نفیس کانوں سے جدا کیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔

"اور کوئی تکلیف؟" مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر دوسری بار ایک ایسا سوال کر رہا

تھا۔ جس کا جواب سننے سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"جناب! آپ نسخہ تو لکھ ہی چکے ہیں۔ اب مزید حال بیان کرنے سے کیا فائدہ؟"

"آپ بالکل فکر نہ کریں" ڈاکٹر نے تسلی دی۔ "میں نے آپ کو گولیاں لکھ دی ہیں۔ چار گولیاں یہیں سے مل جائیں گی۔ دو قسم کے کیپسول آپ کو بازار سے خریدنے پڑیں گے مکسچر اور چار گولیاں آپ تین وقت لیں گے یعنی صبح، دوپہر اور رات، بقیہ دو قسم کے کیپسول آپ مکسچر پینے کے بعد لیجئے گا، اور ہاں کمپونڈر سے انجکشن بھی لگوا لیجئے۔ جب ٹھیک ہو جائیں تو خون ٹیسٹ کرانا نہ بھولئے گا۔" ڈاکٹر کی میکانکی تقریر میرے بالکل پلے نہیں پڑی، لیکن میں "جی بہتر" کہہ کر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر مجھے یہاں سے اٹھنے میں ذرا بھی دیر ہو گئی تو وہ یقیناً میرا پیٹ چاک کرنے کا یا کوئی بڑا آپریشن کرنے کا مشورہ دے ڈالے گا۔ اس سے قبل کہ میں پردہ سرکا کر بھاگ نکلتا۔ ڈاکٹر کی بے تاثر آواز گونجی۔

"پیسے دیتے جائیے۔" میں محجوب سا ہو گیا۔ "معاف کیجئے، میں نے سمجھا کہ پیسے شاید کمپونڈر لیتا ہو گا۔ کتنے دیدوں؟"

"چودہ روپے۔" ڈاکٹر نے نوٹ لیکر دراز میں ڈال دیئے۔ گھنٹی بجائی اور ایک چیخ بلند ہوئی: "انیس نمبر"۔

میں باہر نکلتے ہوئے، یعنی میں ۱۸ نمبر کا مریض ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بیتابی سے اندر آنے والے ۱۹ نمبر کے مریض سے ٹکرا گیا۔ میرا اس وقت کوئی نام نہیں تھا۔ میں صرف ایک مریض تھا جو اپنی سستی، کاہلی یا نقاہت کی وجہ سے سترہ مریضوں کے بعد اس کلینک میں داخل ہوا تھا۔ کلینک جو ڈاکٹروں کے بنگلے تعمیر کرتی ہے یا پھر مریضوں کے مقبرے، جنھیں صحت یاب ہونا ہوتا ہے، وہ تو ویسے بھی ہو جاتے ہیں۔

مظلوم شہزادوں کا تحفہ

آج لندن میں گرم اور خشک موسم ہو گا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کے بھی امکانات ہیں۔ ایسے موسم میں انگریز ساحلِ سمندر پر موسم سے لطف اندوز ہونے کے بجائے بکنگھم پیلس سے سینٹ پال کیتھڈرل کے دو میل لمبے راستے پر جمع رہیں گے۔ انگریز وقت ضائع نہ کرنے میں اپنی شہرت رکھتے ہیں لہٰذا وہ ان راستوں پر صرف شہزادہ چارلس کی بارات گزرنے تک جمع رہیں گے۔ لندن کی پولیس کے منظم اور مضبوط کاندھوں پر آج جیسی گرانقدر ذمہ داری پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ اُسے شاہی خاندان کو شمالی آئرلینڈ کے چھاپہ ماروں کے حملے سے محفوظ رکھنا ہے۔ گو اس کام کے لئے آسمان پر ہیلی کاپٹر بھی گشت کرتے رہیں گے اور پولیس کے ماہر نشانہ باز تمام راستے پر مکانوں کی چھتوں پر اپنے اپنے مورچے سنبھال چکے ہوں گے تاہم شاہی خاندان کی حفاظت کیلئے جتنے انتظامات کئے جائیں کم ہیں۔ شاہی خاندان کا وقار شمالی آئرلینڈ کے باشندوں کے وقار سے کہیں زیادہ اہم ہے اور شہزادہ چارلس کا بیاہ.... بوبی سینڈز جیسے بھوک ہڑتالیوں کی موت سے کہیں زیادہ عظمت اور رفعت والا ہے۔

دنیا بھی اپنی ریت کے مطابق خوشیوں کے شادیانے بجانے والے برطانیہ کے شاہی خاندان کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اسے بوبی سینڈز کی دردناک موت اور اس کی بے بس ماں شاید یاد نہیں رہی۔ یقیناً جب بارات لندن کی شاہراہوں سے گزر رہی ہو گی اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے کھوے سے کھوا اچھل رہا ہو گا۔ بوبی کی اشکبار روح بھی نشانہ بازوں کی نگاہوں سے اوجھل اس منظر کی تماشائی ہو گی۔

یہ ایک عظیم الشان شادی ہے جس کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ اور دل مرعوب

ہو جائیں گے۔ گو تاریخِ عالم میں شادی کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے لیکن اس واقعہ کے بعد سے شادی کی جو رسم برطانیہ اور یورپی ممالک میں پھیکی، بے جان اور بے روح ہو گئی تھی، اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔ برطانوی اپنے شہزادوں کا دل سے احترام کرتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنے لئے باعثِ خیر و سعادت جانتے ہیں۔

ہم ساکنانِ برِصغیر بھی زمانہ ہوا اپنے شہزادوں سے محبت کرتے تھے اور ان کے ابرو کے اشارے کے منتظر رہتے تھے لیکن راجاؤں اور مہاراجاؤں کے ملک سے صدیاں گزریں، بادشاہت اور شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے باوجود ہمیں اپنے شہزادے بھولے نہیں ہیں۔ جنگلوں میں گھوڑے کی چمکدار پشت پر سوار ہو کر، ہاتھوں میں تیر کمان لئے خوبصورت چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہرنوں کا شکار کرتے ہوئے ملکہ کی قدم بوسی کرتے ہوئے، محبت میں محو ہو کر دریا کے کنارے چاند کو تکتے ہوئے، یادگاریں تعمیر کراتے ہوئے مساجد، منبر اور محراب بلند کرتے ہوئے ہمارے شہزادے جو اپنے حسن، وجاہت، علم شمشیر زنی، شرافت اور صلاحیتوں میں کسی اعتبار سے بھی کسی برطانوی شہزادے سے کم نہ تھے۔ ہمارے شہزادے گھوڑے سے بار بار گرنے کے بجائے منہ زور گھوڑوں کو قابو کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔

وہ ملکہ بننے کی خواہشمندوں کے ہجوم کو اپنے گرد جمع کرنے اور ان سے فلرٹ کرنے کی بجائے سچی محبت پر یقین رکھتے تھے اور اپنی محبت کو پانے کے لئے تاج و تخت ٹھکرا دیتے تھے۔ وہ "ڈمی" نہیں حقیقی شہزادے تھے۔ قوت اور اختیار رکھنے والے، برہنہ شمشیروں سے دشمن پر حملہ کرنے والے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ہمارے پیارے شہزادے اپنے ہی وطن میں اجنبی اور بے اختیار بنا دیئے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کشکول تھما دیا گیا اور وہ پھٹی پرانی، میلی کچیلی دھجیوں میں لپٹے دلی کی گلیوں میں گاتے پھرتے تھے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

ہمیں اپنے شہزادے بھولے نہیں ہیں۔

آج رات گئے جب شاہی جوڑا بکھنگھم پیلس واپس آکر ساڑھے چار فٹ اُونچا کیک کاٹے گا۔ جب ملکہ الزبتھ سونے کی مخصوص پلیٹوں میں مہمانوں کو عشائیہ دیں گی اور جب عشائیے کے بعد صبح تک جاری رہنے والا رقص شروع ہوگا، ہمیں اپنے شہزادے بہت یاد آئیں گے۔ وہ خوبصورت، حسین، فراخدل اور کشادہ سینوں والے شہزادے جنھیں اجنبی ہاتھوں نے مشتِ غبار بنا دیا اور اس مشتِ غبار کو گردشِ زمانہ نے ہوا میں اڑا دیا کوئی ظالم ہوا سے پوچھے کہ بتا! اب وہ مٹھی بھر خاک کہاں ہے؟ تاکہ برِصغیر اپنے جلاوطن شہزادوں کے خاک کے گمشدہ ذرّوں کو تحفہ جان کر برطانیہ کے نئے نویلے جوڑے کو بھیج سکے۔ بھلا خوشیوں کے اِن لمحات میں مظلوم شہزادوں کی سرزمین سے ماضی کے آقاؤں کے لئے اس سے قیمتی تحفہ اور کیا ہوگا؟

(۲۹ جولائی ۱۹۸۱ء)

انہوں نے کہا

کافی عرصہ سے ہماری صحافت "انھوں نے کہا" کی گردان میں مبتلا ہو گئی ہے پریس ریلیز ہو یا پریس کانفرنس، انٹرویو ہو یا فیچر، غرضیکہ ہر خبر "انہوں نے کہا" سے شروع ہو کر یہیں پر دَم توڑ دیتی ہے۔ اخبار کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں مگر کہنے والے کا کہا ختم ہونے میں نہیں آتا اور یوں ایک رپورٹر کی زندگی میں صرف "انہوں نے کہا" اور "انہوں نے مزید کہا" کی گونج باقی رہ جاتی ہے۔

رپورٹر .... جو خود بھی بہت کچھ کہنے کی حسرت رکھتا ہے لیکن کہنے والوں کا ہجوم اتنا ہے کہ اُسے دوسروں کے خیالات سننے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کبھی کبھی وہ یقیناً سوچتا ہو گا کہ دوسروں کے جھوٹے سچے، ٹیڑھے میڑھے خیالات کو لکھتے رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی بھینس پال لے اور ملاوٹ شدہ دودھ کا کاروبار شروع کر دے۔ بھینس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پریس ریلیز جاری کرنے پر یقین نہیں رکھتی اور پریس کانفرنس سے خطاب کئے بغیر خاموشی سے دودھ دیتی ہے جسے فروخت کرنے کے بعد بھینس کا مالک "بھینسوں کے نفسیاتی مسائل" کے موضوع پر کسی بھی مذاکرے میں آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری صحافت اور ہماری خبریں "انھوں نے کہا" کے چُنگل میں جس بُری طرح گرفتار ہو گئی ہیں، اس کے پیشِ نظر اب جامعات کے شعبۂ صحافت کو "خبر" کی تعریف بھی تبدیل کر دینی چاہیئے بلکہ ہمارے خیال میں اگر اخبارات کا مطالعہ کرنے والے طلباء سے اس موضوع پر بات چیت کی جائے تو سوال و جواب کی صورت کچھ

یوں ہو گی :۔

س : اچھے طالب علمو! بتاؤ خبر کیا ہے؟

ج : سر! خبر کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کا نام ہے یعنی خبر ایک بھونپو کی طرح ہے جس میں منہ ڈال کر ممتاز اور نمایاں سیاسی راہنما، سرکاری ترجمان، پبلک ریلیشنز افسران، سماجی اور محلہ جاتی تنظیموں کے عہدیداران، یونینوں کے نمائندگان ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتے رہتے ہیں، یوں خبر بنتی رہتی ہے۔ اخبارات چھپتے رہتے ہیں اور بکتے رہتے ہیں۔

س : تمہارے خیال میں یہ ممتاز اور نمایاں افراد اتنا زیادہ کیوں بولتے ہیں؟

ج : اس لئے کہ بولنے ہی سے آدمی نمایاں ہوتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بچے بڑوں کے سامنے بولتے ہیں تو بڑوں کی شخصیت دب جاتی ہے اور بچے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ غالباً اسی لئے بچوں کو بڑوں کے سامنے بولنے سے منع کیا جاتا ہے۔

س : اچھا! اگر تمہیں ان میں سے کسی کی کوئی خبر بنانی پڑی تو کیسے بناؤ گے؟

ج : "نہایت آسانی سے۔ فرض کیجئے سر! ہمیں پیشۂ مرغبانی کی کسی انجمن کے چیئرمین کی پریس کانفرنس کی خبر بنانی ہے تو ہم اسے یوں شروع کریں گے۔ پیشۂ مرغبانی کی انجمن کے چیئرمین نے اعلان کیا ہے کہ ہم مرغیوں کے مطالبات کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مرغیاں دن بدن خودسر ہوتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ مرغیاں نہ صرف خودسر ہیں بلکہ بدتہذیب بھی ہیں۔ انہوں نے عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ وہ مرغیوں کے انڈے کھانا چھوڑ دیں تاکہ مرغیوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں اور انہیں اپنی حقیقت کا پتہ چل جائے۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ بیشک یہ سوال ہمیشہ کی طرح آج بھی محققین اور ریسرچ اسکالروں کے لئے تجسس کا باعث بنا ہوا ہے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈہ۔ اس موقع پر انہوں نے پرانی نسل کی مرغیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ڈربوں میں پلی ہوئی مرغیاں پولٹری فارموں کی مرغیوں کے مقابلے میں وٹامن سے بھرپور ہوتی ہیں۔ انجمن کے چیئرمین نے اپنا داہنا مکہ غصے میں لہراتے ہوئے اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ ان کالی مرغیوں سے نمٹنا بخوبی جانتے ہیں جو کالی بھیڑیں بن کر امن پسند مرغیوں

میں انتشار پھیلا رہی ہیں وغیرہ!

س: شاباش! اچھا اب یہ بتاؤ کہ پریس کانفرنس یا جلسوں سے خطاب کرنے والوں کے برخلاف جو اہم افراد چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، ان کی خبر تم کیسے بناؤ گے۔؟

ج: سر! خاموشی اور خبر نگاری دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ خاموشی سے اہم نوعیت کے کام کرنے والے صرف کام کرتے ہیں اور بس۔ خبر، دن رات بولنے والوں اور پریس ریلیز جاری کرنے والوں کی بنتی ہے کیونکہ کام کرنے والے بولتے نہیں اور بولنے والے کام نہیں کرتے۔ بحیثیت اخبار نویس ہمیں صرف بولنے والوں سے تعلق رکھنا چاہیئے۔

س: کیا کوئی ترکیب ایسی ہے کہ اخبارات کو "انہوں نے کہا" اور "انہوں نے مزید کہا" کی گردان سے نجات دلائی جا سکے؟

ج: یہ بے حد مشکل ہے، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو ان لاتعداد سیاسی پارٹیوں، برساتی انجمنوں، خود ساختہ رہنماؤں اور دانشوروں کا اخباری سطح پر انتقال ہو جائے گا جواب تک صرف اخبارات کی سرخیوں اور "انہوں نے کہا" جیسے بیانات کی آکسیجن پر زندہ ہیں۔ خدارا انہیں زندہ رہنے دیجئے اور ان کے نتھنوں سے شہرت کا آکسیجن نہ ہٹائیے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، کہنے دیجئے۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ ہمیں اور آپ کو اگر اس کہنے سننے کے شور سے بچنا ہے تو ہم کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں گے۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں گے کہ کہنے والے کہتے رہیں، مزید کہتے رہیں، ایک سوال کے جواب میں کہتے رہیں، جائیے ہم نہیں سنتے۔

(۱۴ / جولائی ۱۹۸۱ء)

کوجیک کی بے بسی

صبح میں تھکی ماندی نیند سے بیدار ہوا۔ آنکھیں ملتے ہوئے آئینے کے مقابل آیا اور ششدر رہ گیا۔ آئینہ کہہ رہا تھا: "تمہاری پیشانی تیزی سے کشادہ ہو رہی ہے۔ سر کے بال سرعت سے جھڑ رہے ہیں وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تم مکمل کوجیک ہو جاؤ گے"۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے غور کیا اور بیان کی تصدیق کی۔ یہ سب کچھ کتنی خاموشی سے ہوا۔ میں لمحے بھر غور کرتا رہا اور پھر دل کو تسلّی دی۔ "کیسے کیسے کڑیل نوجوان دیکھتے ہی دیکھتے کوجیک ہو جاتے ہیں تو میں کس شمار قطار میں ہوں"۔ منظر تبدیل ہوا اور آئینے میں ایک گنجا سا آدمی آ کھڑا ہوا' وہ پشیمانی سے بار بار اپنے چٹیل سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"کیا یہ میں ہوں؟"

ہاں وہ میں ہی تھا۔ خدا کی پناہ! میں کتنا بدل چکا تھا۔

میں نے افسردگی سے ہاتھ منہ دھویا اور ناشتے کیلئے بیٹھ گیا۔ ذہن میں بے محل سوالات سنسنا رہے تھے: "اشرف المخلوقات کے سروں سے بال اُڑ کیوں جاتے ہیں؟ کیا اچھے اعمال کے نتیجے میں ایسا ہوتا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی فلسفہ تو ہوگا؟" تب میں اپنے شناساؤں، عزیزوں اور دوستوں کے چہرے تصوّر میں لایا۔ میرے لئے یہ حیرت انگیز انکشاف تھا کہ ان لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی جن کے سر بالوں کی چھتری سے محروم تھے۔ زیادہ تر لوگوں کے سر خوب گھنے تھے اور انہوں نے اُسے سنوار رکھا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی اور میں عالمی شہرت یافتہ شخصیات کے متعلق سوچنے لگا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ دنیا کے ان گنت چوٹی کے دولت مند اور صاحب اقتدار افراد گنجے تھے۔ سابق صدر فورڈ سے پرنس کریم آغا خان تک۔

وہ سب قدرت کی اس عظیم نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم تھے۔ یہاں سے خوشی اور اطمینان کی سرحدیں شروع ہوئیں۔ خوب! گویا میں آئندہ چند برسوں میں دنیا کے عظیم گنجوں کی رفیع الشان سلطنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ یہ خیال کس قدر خوش کن اور فرحت بخش تھا لیکن آپ جانیں میں ایسا شخص تو ہوں نہیں جو اپنے حق میں اچھے اچھے دلائل جمع کر کے چین کی ٹھنڈی سانس بھرے۔ میں چیزوں کے تاریک پہلو پر گہری نگاہ رکھتا ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں "گلاس آدھا خالی ہے" کے قنوطی نقطۂ نظر کا آدمی ہوں۔ سو جب میں اس خوش کن خیال کی گہرائی میں اُترا تو کھُلا کہ دولت مند اور حکمراں طبقہ کا گنجاپن بھی ایک کوالٹی ہے جبکہ دولت، شہرت اور سماجی مرتبے کے بغیر گنجا آدمی سخت بُرا لگتا ہے۔ اس خیال سے مجھے وحشت سی ہونے لگی اور میں ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اُٹھ گیا۔

لگتا ہے آج کا دن پریشان خیالی میں کٹے گا۔ میں کمرے میں آیا اور پرانی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگا۔ مجھے غیر ملکی نظموں کا مجموعہ ہاتھ لگا۔ اس کی ورق گردانی میں ایک مختصر سی نظم سامنے آگئی: مصرعے کچھ یوں تھے:

پتّے گرتے ہیں تو آواز آتی ہے
پرانی دیوار سے پلستر جھڑتے ہیں تو آواز آتی ہے
مگر کیسی عجیب بات ہے
سر سے بال گرتے ہیں تو آواز تک نہیں آتی

یہ نظم مجھے بھا گئی۔ کتنی خوبصورت بات کہی گئی تھی۔ مطالعۂ نظم سے میرے اندر کا شاعر انگڑائی لیکر جاگ اٹھا۔ تب میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور ایک نظم لکھنے میں منہمک ہو گیا۔

کوجیک کی بے بسی

ہمارے بال کتنی آہستگی سے فرار ہو جاتے ہیں
یہ اس وقت فرار ہوتے ہیں
جب ہم سو رہے ہوتے ہیں
یا جب ہم انہیں ترتیب دے رہے ہوتے ہیں

یا جب ہم انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہوتے
وہ خزاں رسیدہ پتّے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں ۔
گر جاتے ہیں، کنگھی میں الجھ جاتے ہیں، تکیے اور بستر سے لپٹ جاتے ہیں
ہم انہیں گرنے سے منع بھی نہیں کر سکتے
نہ چیخ کر نہ دھمکا کر
پتہ نہیں وہ مرتے بھی ہیں یا نہیں
اس کا امکان ذرا کم ہی ہے کہ مَرنا تو صرف آدمی ہے
میں سچ کہتا ہوں
اگر مجھے پانچ سو گھڑ سواروں کی کمان دی جائے
میں سکندر اور نپولین جیسے فاتح حملہ آوروں کو روک دوں گا
لیکن آہ !
میں ان گھڑ سواروں کی مَدَد سے اپنے گرتے ہوئے بالوں کو نہیں روک سکتا

اور اب میں خوش ہو رہا تھا، اپنی نظم پر اور ان بالوں پر بھی جو آہستہ آہستہ گر رہے تھے
(۱۲ر نومبر ۸۳ء)

سُرخ فیتہ

آپ نے بیورو کریسی کے سُرخ فیتے کا اکثر ذکر سنا ہوگا لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ سُرخ فیتہ کیا ہوتا ہے؟ اگر نہیں جانتے تو پھر ایک کہانی سنیئے:۔

کہانی یہ ہے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز ایک لوہار ایک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔

"محل میں ملکہ موجود نہیں ہے۔ کیا ہم تمہارے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔" لوہار نے جواب دیا۔ "یقیناً جہاں پناہ! مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا چاہیئے۔"

"کیوں چاہیئے؟" بادشاہ نے کڑک کر پوچھا۔ بادشاہ عام طور پر سوالات نرم دلی سے پوچھنے کے عادی نہیں ہوتے۔

"میں بھوکا ہوں جہاں پناہ"۔ لوہار نے آہ بھر کر کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی چھائی تھی اور آواز نقاہت سے چور تھی۔

"اوہو، ہم اپنے چانسلر کو بلاتے ہیں۔" بادشاہ نے چونک کر کہا۔ "ایسی باتوں کو وہ خوب سمجھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے تمہارے مطالبات کو رد تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ اتنا معمولی سا مسئلہ ہے کہ اسے بادشاہ براہِ راست اپنی توجہ کے لائق بھی نہیں سمجھتے۔" چانسلر آیا۔ وہ اپنے بے وقت بلائے جانے پر زیادہ خوش نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر خوشامد کی چھاپ لگی تھی۔

بادشاہ نے کہا۔ "چانسلر صاحب، یہ کنگلا ہے جو چوہوں اور چوہیوں کی طرح فاقے کاٹ رہا ہے۔"

چانسلر نے مُڑ کر لوہار کو دیکھا جس کے تاثرات میں بھوک کے ساتھ ساتھ اب توہین کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔

چانسلر نے بڑے ادب سے جُھک کر جواب دیا۔

"میں "چشم زدن" میں فرسٹ لارڈ کو لیکر آتا ہوں"۔

فرسٹ لارڈ آیا۔ اس کے تیوروں ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کر کے نہیں دیگا اور یہی ہوا' مسئلہ سننے کے بعد وہ بولا۔

"جہاں پناہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کام تو چیف کلرک کا ہے"۔ لوہار کی بھوک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُسے تو بس روٹی کا ایک ٹکڑا چاہیئے تھا۔ سوائے سے حاصل کرنے اتنی دُور آنا پڑا۔

چیف کلرک کو بلایا گیا۔ اس نے آتے ہی اپنی گردن کو خم دیا اور لوہار کو دیکھ کر شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا :

"معاملہ تو واقعی نازک ہے مگر اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ روٹی اور آٹے کے ذخائر کی چابیاں تو اسٹیوارڈ کے پاس رہتی ہیں"۔

اسٹیوارڈ کو دیکھنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا یقیناً اُونگھ رہا ہوگا یا شاید اُسے نیند بھی آگئی ہو۔

اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں اعتذار پیش کیا :

"بادشاہ سلامت ! مجھ سے چابیاں کھو گئی ہیں مگر آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک لمحے میں لوہار کو بلاتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر وہ واپس جانے لگا لیکن لوہار پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک پڑا اور مسرت سے چلّا کر بولا۔

"ارے یہ لوہار سامنے ہی تو کھڑا ہے"۔ اور یوں لوہار کی مدد سے اسٹور کا تالا توڑ دیا گیا اور اس بھوکے فاقہ زدہ لوہار کو مٹھی بھر آٹا مل گیا۔

لوہار آٹا لے کر شکریہ ادا کرنے بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہنچا تو وہاں سبھی

موجود تھے۔ چانسلر، فرسٹ لارڈ، چیف کلرک اور اسٹیوارڈ۔ اسٹیوارڈ نے بادشاہ سلامت کے سامنے پہنچ کر اپنی شاندار کارکردگی پر خراجِ تحسین حاصل کرنے کیلئے چیخ کر کہا۔

"بھئی واہ، بھئی واہ۔ ہم نے یہ سب کچھ کتنی ہوشیاری سے کرلیا ہے۔ یہ گہرا اور وسیع مسئلہ حل کرنے کی کوشش کے آغاز کے ساتھ ہی حل ہوگیا ہے۔"

اس جملے پر وہ باری باری مسکرائے اور بادشاہ سے اپنی اپنی تعریف کے طلبگار ہوئے۔ اس سے قبل کہ بادشاہ اپنے اہلکاروں کو اتنے شاندار کارنامے پر کسی میڈل یا ایوارڈ کا مستحق گردانتا۔

لوہار بولا۔ "شکریہ، بہت بہت شکریہ۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے لہجے میں یکایک شدّت آگئی اور وہ بری طرح دھاڑا: "او احمقو اور بدکردارو۔ جاؤ اپنی پناہ گاہوں میں چھپ کر سڑتے رہو۔ اب آئندہ جب کبھی مجھے فاقہ ہوگا۔ تو یہ سب کچھ میں خود کرلوں گا۔"

کہانی ختم ہوگئی۔ اس کے اختتام پر مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتانا کہ یہ کہانی ایڈورڈ کارپنیٹر کی ایک نظم سے اَخذ کی گئی ہے۔ یہ نظم بہت پرانی ہے۔ بہت ہی پُرانی، مگر یوں لگتا ہے جیسے آج ہی کہی گئی ہو۔!

(۳ دسمبر ۱۹۸۱ء)

ثبوت

میں ایک صحافی ہوں جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جب چاہوں کسی سرکاری افسر کے ساتھ بدتمیزی کرسکتا ہوں۔

آپ کون ہیں؟

رچرڈ بیک نے اپنی کتاب ILLUSIONS میں لکھا ہے کہ ہماری زندگی کے عام سوالات ہی دراصل گہرے ترین سوالات ہیں جن پر آپ جتنا غور کرتے جائیں گے ان کی معنویت بدلتی جائے گی۔ مثلاً آپ کہاں جارہے ہیں؟ آپ کا گھر کہاں ہے؟ میں نے ان سوالوں پر جس قدر غور کیا' الجھتا چلا گیا۔ بلکہ ذرا سی دیر میں سوالوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ آپ کون ہیں؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ خوش ہیں؟ کیا آپ کا کوئی دوست ہے؟ ہم لوگ کم و بیش پچاس ساٹھ سال تک زندہ رہتے ہیں اور ان سوالوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم بالکل نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟ کوئی ہم سے پوچھتا ہے تو اُسے اپنا نام بتا دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنے ناموں میں بند ہیں؟ یا اس سے ہٹ کر بھی کچھ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے ناواقف ہیں' دوسروں سے روز ملتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملاقات کبھی نہیں کرتے بلکہ ہم تو خود کو پہچانتے بھی ہیں تو دوسروں کے حوالے سے۔ دوسرے ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں اور اسی کو ہم سچ جان لیتے ہیں اور اسی امیج کو برقرار رکھنے میں زندگی بتا دیتے ہیں۔ کیا اس زندگی کو ہم اپنی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ یا یہ ہماری زندگی تھی جو ہم نے دوسروں کے آدرش پر گزاری اور آگے بڑھئے۔ ہم جس گھر میں پیدا ہوتے' پلتے اور بڑھتے ہیں' جس سے گہری یادیں اور خواب وابستہ ہوتے ہیں جس سے بچھڑ جانے پر ہم رنجیدہ خاطر ہونے اور اُسے یاد کرتے ہیں اور دوبارہ اسی ماحول میں رچ بسنے کی تمنا دل میں رکھتے ہیں۔ سوچئے کہ یہی آپ کا گھر ہے؟ کیا گھر اسی کو کہتے ہیں؟ کبھی تو یہ خواہش ہوتی ہوگی کہ آپ کہیں اور پیدا ہوتے' کسی اور آب و ہوا میں اپنا بچپن اور جوانی بتاتے۔ یوں

بھی ہوتا ہے کہ اس گھر کی خوشیاں اجنبی سی لگنے لگتی ہیں اور یہاں سے ملنے والی تلخی اور غصہ اور جھنجھلاہٹیں اتنی بیزار کن ہوتی ہیں کہ آپ اس سے دور بھاگ جانا چاہتے ہیں لیکن نہیں بھاگ پاتے کہ گھر کے دروازے طاقتور مقناطیس کی طرح ہر شام، ہر رات آپ کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور آپ تھکے ہوئے ملول حالت میں، نہ چاہتے ہوئے بھی لوٹ آتے ہیں۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کو کچھ نہیں معلوم۔!

عجیب اور شاید کسی حد تک مضحکہ خیز بات ہے کہ آپ اس امر سے بھی لاعلم ہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ عزت، شہرت، دولت، اقتدار، حسن، کہیں آپ کو دھوکہ تو نہیں ہوا اپنی خواہشات کا بھید پانے میں اکثر دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ذرا ان سے پوچھئے جنھیں یہ ساری چیزیں حاصل ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہیں گے مزید عزت، مزید دولت، مزید اقتدار، مزید حسن! لیکن اوناسس جسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں، محمد علی کلے جس کی شہرت عالمگیر ہے۔ الزبتھ ٹیلر چار دانگ عالم میں جس کے حسن کا شہرہ رہا۔ ریگن جنھیں ایک عالمی طاقت کا سربراہ ہونا نصیب ہے۔ اب یہ لوگ کیا چاہتے ہوں گے۔ کیا یہ کچھ نہیں چاہتے۔ کیا ان کی خواہشیں تکمیل کو پہنچ گئیں؟ کیا یہ کبھی اپنی شہرت سے، دولت سے، اقتدار کی طاقت سے، حسن سے اکتاتے نہیں ہوں گے؟ کیا وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں یا ابھی نہیں ابھی اور چلنا ہے۔ کوئی کہے گا مکمل اطمینانِ قلب ہی اصل منزل ہے لیکن شاید وہ یہ نہ بتا سکے کہ وہاں تک کون سا رستہ جاتا ہے۔؟

اگر آپ ان سوالوں پر سوچتے ہیں پھر کیا خیال ہے، اگلے سوال کے بارے میں کہ کیا آپ خوش ہیں؟ آپ خوش رہ بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ آپ کو ان سوالوں کے جواب نہیں معلوم۔ تجارت کی گہما گہمی سے، نوکری چاکری کی یکسانیت سے، فرصت کے اکیلے پن میں جو اکتاہٹ اور مزاج میں چڑچڑا پن آپ کے اندر پیدا ہوتا ہے اس کا سبب غالباً باطن میں ان ہی سوالات کی غیر محسوس موجودگی ہے۔ ممکن ہے شعوری طور پر آپ ان سوالات سے واقف نہ ہوں لیکن کبھی تو رکنا چاہیئے، ٹھہرنا چاہیئے، ہمیں جلدی کاہے کی ہے۔ اس جلد بازی میں ہم زندگی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہے۔ ہمارا رویہ ایک اچھے میزبان

کا سا ہونا چاہیئے۔ زندگی ہمارے گھر مہمان بن کر آئی ہے اور ہم اس کی خاطر خواہ تواضع
نہ کر کے ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ وہ بن بلائی مہمان ہے لہٰذا اس کی جیب سے سب کچھ
نکلوا لینا چاہیئے۔ اتنی چالاکی اور عیّاری برت کر کیا ہم اپنے گھٹیا اور ارزل ہونے کا ثبوت
نہیں دے رہے؟ جو چیز دینے کی ہے وہ تو صرف محبت ہے اور وہ ہمارے بیچ سے اُٹھ
گئی ہے۔ بغیر محبت اور بغیر کچھ دینے کا حوصلہ رکھے زندگی بد دیانت بیوپار ہے۔ اور ہم
بیوپاری پوچھتے ہیں: "کیا ہمارا کوئی دوست ہے؟" بعض سوالوں کا جواب ہمیں خود دینا
پڑتا ہے اور بعض کا جواب وقت دیتا ہے۔ ہمارے اکثر خوابوں کو وقت ریاضی کے غلط
طریقے سے حل شدہ سوالات کی طرح کاٹ پھینکتا ہے اور ہم اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے ہیں۔

(۲۶ جولائی ۸۳ء)

مسائل سے دوستی

گٹر لائن اچانک کسی رکاوٹ کی وجہ سے بند ہو گئی اور آنگن میں گندا پانی جمع ہونا شروع ہو گیا۔ گندے پانی کی لکیر جب بڑھتے بڑھتے میرے کمرے کی دہلیز کو چھونے لگی تو میں نے آٹھویں بار اپنا مکّہ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا کہ :

"اب میں کراچی میں نہیں رہوں گا۔"

پانی کی ایک لہر اُچک کر بولی۔

"کیا واقعی"؟

میں مشتعل ہو کر چیخا۔

"بالکل۔ میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

میری چھوٹی بہن جو میز پر جھکی حساب کا کوئی سوال حل کر رہی تھی، کہنے لگی۔

"بھائی جان! آخر ہم یہاں سے کب جائیں گے۔"؟

"بہت جلد چلے جائیں گے مونی۔"

"لیکن کہاں جائیں گے؟" پانی کی اسی لہر نے اُچک کر پوچھا۔

"ہاں واقعی میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ہم کہاں جائیں گے؟"

مونی نے سر اٹھا کر سوال کیا۔

"مونی ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے لیکن ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ یہ بڑا گندہ شہر ہے۔"

اتنا کہہ کر میں پرانے ڈبے سے گندا پانی نکال نکال کر گلی میں پھینکنے لگا۔

میں اور مونی کراچی کی مصروف اور مشینی زندگی سے تنگ آچکے ہیں۔ اکثر بس کا گھنٹوں انتظار کرتے ہوئے، پانی کی تلاش میں کہیں دُور جاتے ہوئے، یا کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دیکھ کر میں غصّے سے اپنا مکّہ ہوا میں لہراتا ہوں۔

"اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

مونی پوچھتی ہے کہ اگر میں یہاں نہیں تو پھر کہاں رہوں گا؟ میں اسے سمجھاتا ہوں، دیکھو مونی خدا نے بڑی طویل و عریض کائنات بنائی ہے اور یہ کائنات انسانوں کی رہائش گاہ ہے لہٰذا ہم جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں۔

وہ پوچھتی ہے۔

"کیا اس کے لئے پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"بالکل ہوتی ہے۔"

"کیا ہمارے پاس پیسے ہیں ؟

"ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں لیکن میرے دونوں ہاتھ سلامت ہیں، میں ان سے پیسے پیدا کرلوں گا اور پھر ہم کہیں کسی اچھے سے شہر میں چل کر رہیں گے۔ جہاں گٹر لائن بند نہ ہوتی ہو، پانی کی پائپ لائن نہ پھٹتی ہو اور آئے دن سڑکوں پر آدمی کتے بلیوں کی طرح نہ مارے جاتے ہوں۔"

یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے اور تالیاں بجا بجا کر کمرے میں ناچنے لگتی ہے۔ وہ کمرے سے باہر نہیں جاسکتی، کیونکہ آنگن میں گندا پانی جمع ہے۔ اگر یہ گندا پانی موجود نہ ہوتا تو شاید وہ یہ خوشخبری بھاگ کر پڑوس میں اپنی دوست کو سناتی لیکن مونی کو پتہ ہے کہ اس عظیم شہر کے مضافاتی اور پسماندہ بستیوں کے اکثر گھر پہلی بارش میں ڈوب جاتے ہیں۔ گندگی کے ڈھیر میں مونی جیسے بچوں کی پرورش ہوتی ہے اور نلکے سے دو بوند پانی کے حصول کے لئے گھنٹوں لمبی قطار بندھی رہتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ کراچی نے شہر کی اکثریت کو کبھی بہت زیادہ خوشی نہیں دی۔ اس کے برعکس یہاں کے رنگ برنگے، نت نئے الجھے ہوئے پیچیدہ مسائل نے رہی سہی خوشیاں

بھی چھین لی ہیں اور اس کے عوض ذہنی تھکن، روحانی انتشار اور معاشی پریشانیاں بخش دی ہیں۔ لوگ دن بھر لال نوٹوں کا تعاقب کرتے ہیں تاکہ اپنے ان مسائل پر قابو پاسکیں لیکن مسائل کی گرفت ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

میں ان مسائل سے گھبرا کر شہر چھوڑنے کا اعلان کرتا ہوں، غصّے میں مکّہ ہوا میں لہراتا ہوں لیکن جب کبھی اپنی تنہائیوں میں اس شہر سے علیحدگی کا تصوّر کرتا ہوں تو اداس ہو جاتا ہوں۔

ایسا لگتا ہے کراچی اپنے مسائل اور پریشاں حالی کے باوجود ایک شہر نہیں، ایک آدمی ہے، ہمارا دوست ہے اور جس سے ہمیں پیار ہے۔

مونی پوچھتی ہے۔ "بھائی جان ہم یہاں سے کب جائیں گے۔؟"

میں تھک کر کہتا ہوں۔

"مونی ہم یہیں رہیں گے"۔

"کیا ہمارے پاس دوسری جگہ جانے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔؟"

"وہ تو ہیں مگر ہم کہیں نہیں جائیں گے"۔

"لیکن کیوں"

"بس یونہی کوئی خاص وجہ نہیں"۔

یہ سُن کر مونی اداس ہو جاتی ہے اور میں جھک کر ڈبّے سے گندے پانی کو نکال کر گلی میں پھینکنے لگتا ہوں۔

تب گندے پانی کی لہر واپس جاتے ہوئے مڑ کر کہتی ہے۔

"میں پھر آؤں گی"۔

"ضرور۔ ضرور"۔ میں خوش اخلاقی سے کہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے یہیں اسی شہر میں رہنا ہے۔ انہی دیر سے آنے والی بسوں، گندے پانی کی لہروں، کھلے ہوئے مین ہول اور ذہنی پریشانیوں میں زندگی بسر کرنی ہے۔ میں نے ایک شریف شہری کی طرح ان مسائل سے دوستی کرلی ہے۔ مجھے یقین ہے اب یہ دوستی مجھے دوسرے شہر یا گاؤں کی طرف لیجانے سے ہمیشہ روکے رکھے گی۔

(۹، ستمبر ۱۹۸۱ء)

جُوتوں سمیت

اشفاق احمد صاحب نے ڈرامہ ۸۳ء کے کھیل "ننگے پاؤں" میں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کو عہد جدید کے تناظر میں پیش کر کے عصرِ حاضر کی سائنسی ترقی، سپر پاورز کی بالادستی اور انسان کے اخلاقی اور تہذیبی زوال پر بلیغ طنز کیا ہے اور ساتھ ہی بادشاہت کے نظام کی مضحکہ خیزیت بھی عیاں کی ہے۔ ڈرامہ دیکھ کر جہاں ہمیں بے انتہا حیرت اور مسرت ہوئی، وہیں یہ خیال بھی آیا کہ اگر ہمارے اشفاق صاحب ٹائم مشین میں سوار، جلال الدین محمد اکبر کے محل میں جا اتریں تو انہیں کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہو سکتا ہے۔ جب ہم نے تخیل کی مدد سے ان مناظر کو دیکھا تو نتیجہ کچھ اس قسم کا آیا۔

(شہنشاہ اکبر دربار سجائے کرّوفر سے مسند پر براجمان ہے۔ نورتن اور دیگر معززین دربار، سر جھکائے مؤدب ہیں کہ مخبر کورنش بجا کر اطلاع دیتا ہے کہ ایک اجنبی کہ نام اپنا اشفاق احمد بتاتا ہے، ایک عجیب الخلقت سواری سے محل کی چھت پر اترا ہے اور باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ اجازت ملنے پر محافظین اشفاق احمد کو پکڑ کر دربار میں لاتے ہیں۔)

شہنشاہ اکبر: (بارعب آواز میں) اجنبی! حرفِ مدعا بیان کر، تاکہ تجھے بنا اجازت محل میں گھس آنے کی جلد سزا دی جا سکے۔

اشفاق احمد: حضور کا اقبال بلند ہو۔ میں ایک ادنیٰ ڈرامہ نگار ہوں اور سرکار کی اجازت سے اپنی مرضی کے مطابق ڈرامے لکھتا ہوں۔"

اکبر: (بیربل سے) "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

بیربل: (کھڑے ہو کر ادب سے) حضور! اجنبی سے چند سوالوں کی اجازت ملے تو

اس کی اصلیت معلوم ہو۔

اکبر: اجازت ہے۔

بیربل: (اشفاق احمد سے) اے اجنبی! تو ڈرامہ لکھنے کے علاوہ کیا کرتا ہے؟

اشفاق: یہ عاجز اردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر ہے اور اُردو کی ترقی کے لئے اردو میں سائنسی کتابیں چھپواتا ہے۔ خود بھی کتابیں تصنیف کرتا ہے۔ ٹی وی کے مذاکرے اور مباحثے کے پروگراموں میں شرکت کرتا ہے اور فاضل اوقات میں نئے اور اچھوتے خیالات سوچتا ہے۔

(نورتن ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے اور مسکرانے لگتے ہیں)

بیربل: سوال یہ ہے کہ تو ایک کام جی لگا کر کیوں نہیں کرتا؟ بیک وقت اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر کیوں لاد رکھا ہے؟ کیا تیرے ہاں اہلِ کمال پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں اور کیا تجھے اتنے مشاغل کے بعد بھی سوچنے کی مہلت مل جاتی ہے۔

اشفاق: جناب عالی! ڈرامہ لکھنا میرا مشغلہ ہے، نوکری میرا پیشہ اور نئی نئی باتیں سوچنا اور باتیں بنانا میری عادت سی ہو گئی ہے۔

بیربل: کیا تجھے ڈراموں سے اتنا معاوضہ نہیں مل جاتا کہ تو نوکری پر مجبور ہے؟

اشفاق: کیا عرض کروں، صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔ ہمارے تمام ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، شاعری اور ادب میں کارِ نمایاں انجام دیتے ہیں اور پھر بھی کہیں نہ کہیں ملازمت کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

بیربل: افسوس صد افسوس! مگر اے شخص تو ڈراموں میں لکھتا کیا ہے؟

اشفاق: حضور کے بادشاہ کا تاج سلامت رہے، میں اپنے ڈراموں میں معاشرتی برائیوں پر طنز اور اخلاقی مسائل کا بیان کرتا ہوں۔

بیربل: کیا تیرے معاشرے میں برائیاں بے پناہ ہیں اور کیا رعایا اخلاقی مسائل سے اس درجہ بے خبر ہے کہ تجھے ان کے بیان کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اشفاق: جی نہیں! لوگ سب کچھ جانتے ہیں مگر ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

بیربل : تو کیا تیرے ڈرامے دیکھ کر لوگ نیک بن جاتے ہیں اور تیرے کہے کو دل وجان سے قبول کر لیتے ہیں؟

اشفاق : عاجزی وندامت سے عرض پرداز ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لوگ جیسے ہیں ویسا ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

بیربل : تو پھر تیرے ڈراموں کا حاصل؟

اشفاق : حضور اپنی سی سعی کئے جاتے ہیں۔ شاید لوگ کبھی سدھر جائیں۔ پھر ہم لکھنے والے لکھتے ہیں تو آمدنی بھی ہوتی ہے۔ تھوڑی بہت مشہوری بھی ہو جاتی ہے۔ دیگر فائدوں کی تفصیل علیحدہ ہے۔

(نورتن اور دیگر درباری ہنسنے لگتے ہیں اور اکبر کے چہرے پر بھی تبسم کھل جاتا ہے۔)

بیربل : تیرا بادشاہ اپنے حکم خاص سے رعیت کو بُرے اعمال سے روک کیوں نہیں دیتا

اشفاق : جناب عالی! ہمارے ملک میں بادشاہت نہیں، مارشل لا رہے۔

اکبر : (تعجب سے) مارشل لا؟

اشفاق : جی سرکار! مارشل لا! یہ بادشاہت کی ذرا ترقی یافتہ شکل ہے۔

(بیربل اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ اکبر براہِ راست اشفاق احمد سے مخاطب ہے)

اکبر: تو کیا رعایا مکمل بادشاہت کی طلبگار نہیں؟

اشفاق : ہمارے ملک کی رعایا، آپ کی رعایا سے بہت مختلف ہے۔ وہ جمہوریت کے نفاذ اور انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کرتی ہے۔

اکبر : (ناراض ہو کر) جمہوریت؟ انتخابات؟ تو کیا ہذیان بک رہا ہے؟

اشفاق : یہ بندہ بقائمیٔ ہوش وحواس ہے۔ جمہوریت کا مطلب ہے عوام کی حکمرانی۔

اکبر : کیا؟ عوام کی حکمرانی؟ کروڑوں عوام اور ایک حکومت؟ یہ کیا مذاق ہے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ عوام جب حکومت میں آجائیں گے تو وہ حکومت کس پر کریں گے۔؟

اشفاق : حضور! اسی کے لئے انتخابات کا طریقۂ کار وضع کیا گیا ہے تاکہ عوام کے نمائندے عوام کے ووٹوں سے برسرِ اقتدار آجائیں اور عوام کی مرضی کے مطابق نظامِ حکومت چلائیں

اکبر: (بلند آواز میں) واحیرتا! یہ کس جہان کی باتیں ہیں جو آج ہمیں سنائی جا رہی ہیں (سوچتا ہے اور پھر مخاطب ہوتا ہے) کیا تیرا بادشاہ رعایا کے اس خیال سے متفق ہے۔؟

اشفاق: جی سرکار عالی وقار! ہمارے محترم مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر ذی وقار اس مطالبے کو اصولی اور اخلاقی طور پر درست مانتے اور علی الاعلان اس کا اقرار کرتے ہیں۔

اکبر: اور تو بھی درست مانتا ہے۔؟

اشفاق: ظاہر ہے سرکار! میں اپنے صدر ذی وقار کی رائے سے اختلاف کی جرأت خود میں نہیں پاتا۔

اکبر: شاباش! ہم اس جواب سے خوش ہوئے ہیں اور تجھے خلعتِ فاخرہ سے نوازنے کا حکم دیتے ہیں، ہاں مگر ابھی یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ جب تیرا بادشاہ رعایا کی خواہش سے متفق ہے تو پھر وہ انتخابات کیوں نہیں کرا دیتا۔؟

اشفاق: حضور! انہیں انتخابات کے لئے مناسب وقت کا انتظار ہے، ابھی اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں یا غیر جماعتی بنیادوں پر، سلطنت میں صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی نظام، صدر اور وزیرِ اعظم کے اختیارات کی تقسیم پر بھی تنازعہ ہے۔ اس طرح کے ڈھیروں مسائل ہیں۔

اکبر: (پریشان ہو کر) اے اجنبی! کیا تیری مملکت کے حاکم اور اس کی رعیت کے پاس وقت کی اس قدر افراط ہے کہ ان مسائل کے تعین پر مہینوں اور برسوں کو یوں ضائع کیا جا رہا ہے۔ ہمارے نورتن گواہ ہیں کہ ہم اتنی مدت میں نہ جانے کتنی مملکتیں فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیتے۔

اشفاق: خادم حضور کے قول سے متفق ہے۔

اکبر: تو اپنے ڈراموں کے ذریعے رعایا کو ایسی نصیحت آمیز، حکمت افروز باتیں کیوں نہیں بتاتا۔؟

اشفاق: جی تو بہت چاہتا ہے مگر ٹی وی پر پابندیاں بہت ہیں، سرکار کی اجازت

کے بغیر ٹی وی اسکرین پر ایک پتّہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔

اکبر : کیا ٹی وی پر بادشاہ کا دربار سجتا ہے؟

اشفاق : جی نہیں حضور! چونکہ رعایا باقاعدگی سے ٹی وی دیکھتی ہے، اس لئے سرکار کی پالیسی کے منافی پروگرام پیش کرنے کی سختی سے ممانعت ہے۔

اکبر : سبحان اللہ! یہ شے ہمیں بیحد بھا گئی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ٹی وی اسٹیشن قائم کئے جائیں اور اس اجنبی شخص کو جو اپنا نام اشفاق احمد بتاتا ہے، اس کا ناظم مقرر کیا جائے۔

(نورتن ناگواری اور حسد سے اشفاق احمد کو گھورتے ہیں۔)

اشفاق : حضور کا اقبال بلند ہو، کیا جوہر شناس نگاہ پائی ہے۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

اکبر : اجازت ہے۔

اشفاق : ہماری اہلیہ بانو قدسیہ بھی بہت اچھی ڈرامہ نویس ہیں، آپ اجازت دیں تو انہیں بھی یہیں لے آؤں۔

اکبر : جاؤ انہیں بھی لے آؤ۔ (اشفاق احمد کورنش بجا لا کر الٹے قدموں چلے جاتے ہیں)
(واپسی پر ٹائم مشین خراب ہو جاتی ہے)

دن کی ناکامی اور قلب کا اطمینان

میں نے ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے ایک دن گزارا۔ یوں تو زندگی میں ان گنت صبحیں اور دوپہریں آئی ہیں لیکن مجھے ایک دلچسپ تجربے کی سوجھی۔ میں نے ایک ایسا دن گزارنے کا فیصلہ کیا جس پر مجھے آئندہ کوئی ندامت یا پچھتاوا نہ ہو۔

اگلے روز میں دفتر کے لئے کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ پڑوس کا لڑکا آگیا۔ وہ یہ کہنے آیا تھا کہ اس کے ابو دفتر نہیں جا سکیں گے اور وہ یہ اطلاع بذریعہ ٹیلیفون دفتر دینا چاہتے ہیں۔ میرے گھر پر گزشتہ تین ماہ سے ٹیلیفون کے ناقابل برداشت بل آرہے ہیں۔ میں نے مجبوراً ٹیلیفون لاک کر کے غیر ضروری کال نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لڑکا پوچھ رہا تھا۔ "کیا آپ فون کرنے کی اجازت دیں گے۔؟" چونکہ میں نے ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے آج کا دن گزارنے کے بارے میں سوچا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں میں اسلام میں پڑوسی کے حقوق سے بھی ناواقف نہ تھا لہٰذا میں نے نہایت خوشدلی سے فون کرنے کی اجازت دیدی۔ چند ہی لمحے میں پڑوسی صاحب اپنی عینک صاف کرتے ہوئے تشریف لائے اور رسمی شکریہ کے بعد ڈائل گھمایا۔ لائن انگیج ملی، پھر نمبر غلط مل گیا، دوسری بار بھی نمبر غلط ملا۔ تیسری بار میں انہیں کامیابی ہوئی۔ دو کالوں کے ضائع جانے کا میں نے شدت سے برا منایا لیکن جلد ہی میں نے اپنے منفی جذبات پر قابو پالیا۔ جب پڑوسی صاحب ریسیور کریڈل پر رکھ چکے تو میں نے کہا۔ "کہیں اور کال کرنا ہو تو آپ بے شک کر سکتے ہیں۔" یہ جملہ ادا کرتے وقت جانے میری آواز میں کیا بات پیدا ہو گئی کہ پڑوسی نے اُسے طنز سے تعبیر کیا اور عینک صاف کرتے ہوئے تیزی سے دروازے سے نکل گئے۔

قمیص کے بٹن بند کرنے کے بعد میں گھر سے باہر آیا تو کارپوریشن کا جمعدار مل گیا وہ لمبی سی بانس کی چھڑی سے گٹر کی نکاسی میں مصروف تھا۔ میں اُسے دیکھ کر اخلاقاً مسکرایا اس نے بھی انکساری سے دانت دِکھا دیئے۔ پھر اس نے اشاروں کنایوں میں کام کی زیادتی اور تنخواہ کی کمی کا رونا رویا۔ میں اِس صورتِ حال سے بچنے کیلئے روانہ ہوا چاہتا تھا کہ اُس نے براہِ راست "نذرانہ" طلب کیا۔ میں جانتا تھا کہ اسلام میں سائل کو مایوس لوٹانا مستحسن قرار نہیں دیا گیا۔ اس لئے جیب سے پانچ روپے نکال کر جمعدار کو تھما دیئے۔ جمعدار نے میرے اُن بال بچوں کو سُکھی رہنے کی دعا دی جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

بس اسٹاپ پر مسافروں کے ہجوم میں کم و بیش پون گھنٹہ کھڑا رہنا پڑا کیونکہ جذبۂ ایثار سے کام لیتے ہوئے میں بس میں سوار ہونے کیلئے دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع دیتا رہا اور جب بس میں بیٹھنے کو جگہ ملی تو بھی مجھے جلد ہی ایک باریش بزرگ کے احترام میں اٹھ جانا پڑا گو مجھے اس نیکی سے تکلیف تو کافی ہوئی لیکن میرے ضمیر نے اس اقدام کو سراہا اور میں نے خود اپنی پیٹھ ٹھونکی۔

گھر سے جلد نکل جانے کی وجہ سے میں معمول کے برخلاف وقت پر دفتر پہنچا۔ میں نے اپنی میز کرسی خود صاف کی کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے آدمی کو اپنا کام خود کرنا چاہیئے۔ یوں بھی تو دفتر میں یہ کام میں خود ہی کرتا ہوں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ دوسری طرف مقامی شاعر اور میرے عزیز دوست وفا سندیلوی اپنی تازہ غزل کے چار اشعار سنانے کے خواہاں تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ دفتری اوقات میں دفتری امور پر گفتگو کریں لیکن اشعار انہوں نے تازہ تازہ کہے تھے اور اُن کے پیٹ میں بُری طرح سے مروڑ اٹھ رہا تھا چونکہ مذہب میں دِل توڑنا حرام ہے اس لئے میں نے انہیں اشعار سنانے کی اجازت دے دی۔ وفا سندیلوی کے اشعار نہایت بودے اور بے رنگ تھے ہمیشہ کی طرح، لیکن میں نے خلافِ معمول منافقانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے اُن سے صاف صاف کہہ دیا کہ انہیں شاعری ترک کر دینی چاہیئے کیونکہ یہ اُن کے بس کا روگ نہیں۔ دوسری طرف سے لائن منقطع کر دی گئی۔

اگلے ہی لمحے ایک دوسرے دوست آدھمکے۔

پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا"؟

بولے۔ "اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا گپ شپ لگالوں"۔

عرض کیا۔ "لیکن اس وقت تو میں ڈیوٹی پر ہوں"۔

میز پر ہاتھ مار کر بولے: "اب چھوڑو بھی"۔

لاکھ سمجھانے پر بھی کہ یہ مناسب بات نہیں ہے، وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور یوں اُن کے ہمارے دیرینہ تعلقات نہایت خوشگوار ماحول میں کشیدہ ہوئے۔

شام کو گھر لوٹ کر میں نے دن بھر کے واقعات پر سنجیدگی سے غور کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ آج میں نے ایک ناکام مگر مطمئن دن گزارا ہے لیکن ناکامی کا بوجھ ایک دن تو اٹھانا ممکن ہے، ساری زندگی نہیں۔

(۲۱، جون ۱۹۸۳ء)

تجویز ایک رائٹرز کلب کی

"جنگ" کے مراسلات کے کالم میں ایک مراسلہ نگار بھائی نے نہایت اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے' انہیں شکوہ ہے کہ کراچی جیسے عظیم شہر میں جہاں ہزاروں شاعر و ادیب بستے ہیں، کوئی ایسا کلب موجود نہیں ہے جہاں وہ گھڑی دو گھڑی ٹانگیں پسار کے تازہ ترین ادبی رجحانات پر خوش گپیاں کر سکیں۔ مراسلہ نگار نے بلدیہ کراچی پر الزام عائد کیا ہے کہ اُسے شہر میں ایک عدد رائٹرز کلب قائم کرنا چاہیئے' مزید یہ کہ مجوزہ کلب میں سیلف سروس کیفے ٹیریا بھی قائم ہو جائے تو کیا کہنے ہیں۔

مراسلہ نگار بھائی کی تجویز معقول ہے۔ بلدیہ اب تک ٹیکسوں کی شکل میں شہریوں کی جیبوں کی صفائی کرتی رہی ہے لہٰذا اس سے یہ توقع بیجا نہیں کہ وہ لوگوں کے قلب و نظر کی صفائی و ستھرائی کا بھی اہتمام کرے۔ مراسلہ نگار نے جس خلوص سے تجویز پیش کی ہے، اس سے ان کا شاعر یا ادیب ہونا ثابت ہے۔ اچھا ہوتا کہ وہ اپنی اپیل منظوم صورت میں بلدیہ عظمیٰ کے حضور پیش کرتے۔ سُنا ہے بلدیہ کے ذمہ داران منظوم درخواستوں کو اوّلین فرصت میں "انٹرٹین" کرتے ہیں کیونکہ ایسی منظوم درخواستوں کا قاعدہ ہے کہ شاعر پہلے حاجت روا کی شان میں قصیدہ لکھتا ہے اور آخری دو مصرعوں میں اپنی حاجت بیان کرتا ہے۔ مرزا غالب نے قصیدہ کی اسی تکنیک سے بادشاہ کو قابو میں کئے رکھا اور حسبِ منشا وظیفہ پایا۔ مرزا کہتے :

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

اور بادشاہ سلامت مرزا کی مفلسی میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے مارے جلال کے حکم دیتے۔ "خزانے کا منہ کھول دیا جائے"۔

بلدیہ کو شہر میں رائٹرز کلب کے قیام میں ہچکچانا یا معذرت خواہانہ انداز تو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ رئیسِ شہر جناب عبدالستار افغانی ادب دوست آدمی ہیں اور کبھی کبھار مشاعروں کی صدارت فرما کر اس کا ثبوت بھی دیتے رہے ہیں لہٰذا اُن کے دل میں مشاعروں کے علاوہ شاعروں کی عزت بھی ضرور ہوگی۔ ویسے بھی افغانی صاحب پر شاعروں کے کچھ کم احسانات نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں انہیں دوبارہ میئر بننے کی خوشی میں جتنے استقبالیے دیئے گئے، اُن میں مضافاتی شعراء کرام نے شہری مسائل حل کرنے کے ضمن میں اُن کی خدمات کو بغیر کسی صلے کی تمنا کے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شاعروں نے اپنے قصیدوں میں میئر کراچی کو جو مقام و مرتبہ عطا کیا ہے، اس کے بعد اُن پر واجب ہے کہ وہ بھی شاعروں اور ادیبوں کو اپنے شہر میں ویسا ہی مقام و مرتبہ عنایت فرمائیں اور ایک ایسا رائٹرز کلب قائم کردیں جہاں شعراء حضرات کو فکرِ سخن کی آزادی ہو، وہ ایک دوسرے کی تخلیقات و نگارشات کو سنیں اور معمول کے مطابق ان کے بلند ادبی معیار پر اتفاقِ رائے کر سکیں اور جی چاہے تو کبھی کبھار اختلافِ رائے بھی کرلیں۔

کراچی، ادیبوں اور شاعروں کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ انشاءاللہ اس ضمن میں رئیسِ شہر کو مایوسی نہیں ہوگی۔ کلب قائم ہوگا تو ایسا رش لے گا کہ سینما گھر شرما جائیں گے۔ دس ہزار شاعر تو صرف لالو کھیت میں ہیں، چار پانچ ہزار لانڈھی کورنگی سے نکل آئیں گے۔ ڈھائی تین ہزار ڈرگ روڈ، ملیر وغیرہ میں ہوں گے۔ کھارادر اور لیاری کے اردگرد مکرانی اور میمن برادری کی اکثریت ہے لیکن شعر و ادب کسی کی میراث تو ہے نہیں، سو وہاں سے دو ڈھائی شاعر بھی برآمد ہو جائیں تو سمجھو کافی ہے۔ باقی رہے ڈیفنس، پی ای سی ایچ ایس، گلشنِ اقبال، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد جیسے علاقے تو ادب اور شاعری تو خوش نکرے لوگوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اس لئے ان علاقوں میں شاعروں و ادیبوں کی تعداد کے سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں شاعروں کی پیداوار کی وہی کیفیت ہے جو

بنگلہ دیش میں پٹ سن کی پیداوار کی ہے۔

کراچی کاروباری شہر ہے اور اسی بنا پر ملک کے دیگر شہروں کے پڑھے لکھے حلقوں میں بدنام ہے کہ یہاں تمام وقت روپے پیسے کمانے کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں کے شعراء حضرات غزلوں کی نئی نئی زمینیں تلاش کرنے کے بجائے مکان بنانے کیلئے زمینیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور افسانہ نگار حضرات افسانوں کا پلاٹ تو کیا سوچیں گے "گلستانِ جوہر" میں ڈھائی سو گز کے پلاٹ کے لئے کے ڈی اے کے افسران کی خوشامدیں کرتے رہتے ہیں۔ عام لوگوں کی بھی علم و ادب سے دلچسپی برائے نام ہے۔ انہیں کاروباری اور دفتری جھمیلوں سے فرصت ملتی ہے تو ٹی وی کے سامنے مورت بن جاتے ہیں۔ یا پھر معین اختر اور اسمٰعیل تارا کے مزاحیہ خاکوں کا شو دیکھنے مقامی آڈیٹوریم کا رُخ کرتے ہیں۔

آرٹس کونسل ثقافتی سرگرمیوں کا واحد مرکز ہے لیکن وہاں بھی میلہ، نمائش اور بیرونی طائفوں کا سلسلہ بندھا رہتا ہے۔ ادب ودب کی بات تو کوئی کرتا ہی نہیں ہے۔ ہاں مہینے میں ایک آدھ بار کسی نئی کتاب کی مہورت ہوتی ہے یا کوئی مشہور ادیب جان، جانِ آفرین کے سپرد کرتا ہے تو اس کی یاد میں تعزیتی جلسہ ہوتا ہے۔ حاضرین کو ان دونوں قسموں کے جلسوں میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا کیونکہ دونوں مواقع پر ایک ہی جیسی تقریریں ہوتی ہیں۔ یعنی صاحبِ کتاب اور مرحوم ادیب کی تعریف میں یکساں طریقے پر مبالغہ آمیزی کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ادب کو اس طرح کی تقریروں سے فروغ حاصل ہوتا تو ان جلسوں کے بعد اب تک کئی شیکسپیئر، کئی ملٹن، کئی ایلیٹ پیدا ہو چکے ہوتے۔

لاہور، پنڈی اور سرگودھا کے ادیب و نقاد حضرات کراچی آتے ہیں تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوتے ہیں کہ یہاں تو ادبی سرگرمیوں کی پھلواری سوکھتی جا رہی ہے۔ نہ کوئی ادبی محفل نہ باقاعدہ مجلس آرائی، نہ وہ قہقہے نہ چہچہے، بس ہر طرف مادیت کا ہنگامہ برپا ہے۔ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس ہے، حلقہ اربابِ ذوق ہے۔ حقیقی بھی اور غیر حقیقی بھی، بلکہ ٹی ہاؤس تو ادیبوں اور شاعروں کا ویسا ہی مستقل اڈہ ہے جیسے بسوں اور ٹیکسیوں کے اڈے ہوتے ہیں۔ وہاں ہر رنگ و نسل کے شاعر جمع ہوتے ہیں۔ شاعری و ادب کس معیار کی تخلیق کرے

اس سے بحث نہیں لیکن شعر و ادب پہ گفتگوئیں خوب رہتی ہیں۔ گفتگوؤں کی علمی سطح کو بھی چھوڑیئے، یہی تھوڑا ہے کہ ادب پر گفتگوئیں ہوتی ہیں اور سگریٹوں کے درجنوں پیکٹ پھونک دیئے جاتے ہیں اور روزانہ چائے کی سینکڑوں پیالیاں پی جاتی ہیں ظاہر ہے حکومت کے کندھوں پر چائے اور سگریٹ کے کھاتے میں اربوں روپے کے زرمبادلہ کا بار یونہی تو نہیں ہے۔

کراچی میں رائٹرز کلب کا قیام ادب اور ادیب کے نشو و نما اور تابناک مستقبل کیلئے ناگزیر ہے۔ یہ کلب شہر میں کسی مقام پر بھی قائم ہو جائے، مناسب ہے۔ اگر کہیں جگہ میسر نہ ہو تو بلدیہ کے کئی مذبح خانے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ کو عارضی طور پر خالی کرالیا جائے۔ مذبح خانے میں رائٹرز کلب کا قیام یوں بھی موزوں رہے گا کہ ہمارے بیشتر شاعر و ادیب، ادب کے ساتھ کم و بیش وہی سلوک کرتے ہیں جو قصاب بکرے کیساتھ کرتا ہے۔

(۵ فروری ۸۴ء)

یہ دو رکعت کے امام

مساجد میں دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ روشن خیال اور بالغ نظر امام صاحبان کا فقدان کیوں ہے؟ اگر یہ بحث چھیڑی جائے تو بات سے بات نکلتی چلی جائیگی۔ ان میں سب سے مضبوط نقطۂ نظر یہ پیش کیا جائے گا کہ صاحب تعلیم یافتہ افراد امامت کا فریضہ کیوں سنبھالیں؟ انہیں تنخواہ ہی کیا ملتی ہے؟ معاشرے میں اس کے سوا ان کا کیا مقام ہے کہ پیدائش پر بچے کے کان میں اذان دیدیں اور موت پر نماز جنازہ پڑھا دیں جب تک اس منصب کو اہمیت، اولیت، عزت اور وقار سے محروم رکھا جائیگا۔ اس منصب پر وہی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے والے مولوی صاحبان فائز ہوتے رہیں گے جن کے نزدیک دین صرف فروعی معاملات کو اچھالنے اور ہر مسئلے کے حل کیلئے ایک تعویذ دیدینے کا نام ہے۔ ظاہر ہے جب معاشرہ انہیں صرف حلوہ پیش کرے گا تو وہ بھی جواب آں غزل کے طور پر معاشرے کو صرف تعویذ ہی پیش کریں گے۔

نیک دل مچھیرا اور لالچی بیوی

آج جانے کیوں سنہری مچھلی اور غریب مچھیرے کی کہانی بہت یاد آ رہی ہے یہ کہانی آپ نے یقیناً پڑھی ہوگی اور اگر نہیں پڑھی تو ایک بہت اچھی کہانی سے آپ محروم رہے ہے۔ کہانی ٹھیک طرح سے تو مجھے بھی یاد نہیں۔ ہاں بس اتنا یاد ہے، وہ ایک غریب مچھیرا تھا جو سمندر سے مچھلیاں پکڑتا تھا اور اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔ ایک روز اس کے جال میں ایک سنہری مچھلی پھنسی۔ مچھلی نے مچھیرے سے درخواست کی کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو مچھلی اس کی ہر خواہش پوری کرنے کیلئے تیار ہے۔ مچھیرا رحمدل اور بیحد نیک تھا۔ اس نے سنہری مچھلی کو آزاد کر دیا اور گھر آ کر یہ ماجرا اپنی بیوی کو سنایا۔ مچھیرے کی بیوی لالچی عورت تھی۔ اس نے مچھیرے کو بیحد برا بھلا کہا اور اسے مجبور کیا کہ وہ جا کر سنہری مچھلی سے دولت آرام و آسائش کی زندگی طلب کرے۔ چار و ناچار مچھیرا پلٹا اور سمندر کے کنارے پہنچ کر سنہری مچھلی کو آواز دی اور یوں مچھلی نے مچھیرے کی بیوی کی خواہش کو پورا کر دیا۔ مچھیرے کے دن پلٹ گئے اور وہ آرام و آسائش سے رہنے لگا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس کی بیوی نے دوبارہ مچھیرے کو اکسایا کہ وہ جا کر سنہری مچھلی سے کہے کہ وہ اور زیادہ آسائشیں چاہتی ہے اور ملکہ کی طرح جینا چاہتی ہے۔ سنہری مچھلی نے مچھیرے کی بیوی کی اس خواہش کی بھی تکمیل کر دی اور مکان جو کچھ عرصہ قبل محض ایک جھونپڑی تھا، محل میں تبدیل ہو گیا۔ کنیزوں اور غلاموں کی ریل پیل لگ گئی۔ مچھیرے اور اس کی بیوی نے اس ٹھاٹ باٹ کی زندگی کا کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ مچھیرا خدا کا شکر بجا لاتا تھا لیکن اس کی بیوی کی لالچ

تھی کہ بڑھتی ہی گئی اور ایک صبح وہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ سورج کی کرنیں نیند میں خلل انداز ہوئیں۔ لالچی عورت کو سورج کی یہ مداخلت ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ سنہری مچھلی سے کہے کہ چونکہ سورج نے اسے پریشان کیا ہے اور اس کی میٹھی نیند پر خاک ڈال گیا ہے۔ اس لئے سورج کو اس کے تابع کیا جائے۔ مچھیرا یہ سن کر دہل گیا اور اس نے سمجھایا کہ جتنا کچھ حاصل ہو گیا ہے اس پر قناعت کرنا بہتر ہے کچھ عجب نہیں کہ سنہری مچھلی خفا ہو جائے لیکن بیوی ایک نہ مانی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مچھیرا سمندر کے کنارے پہنچا۔

اس روز سمندر میں بے پناہ طوفان آیا تھا۔ اس نے سنہری مچھلی کو آواز دی۔ مچھلی نے پانی سے سر نکالا اور مچھیرے نے گڑگڑاتے ہوئے اظہارِ مدعا کیا۔ سنہری مچھلی سخت برہم ہوئی اور اس نے کہا کہ تمہاری بیوی انتہائی لالچی اور حریص عورت ہے افسوس کہ اس نے قناعت نہ کی اور اپنے انجام کو پہنچی۔ مچھیرا سر جھکائے واپس لوٹا تو نہ محل تھا نہ وہ آرام و آسائش کی زندگی۔ اس کی بیوی ماضی کی طرح ایک جھونپڑے میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔

یہ کہانی تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ غریب مچھیرا جو سادہ لوح اور محنتی انسان ہے، اسے اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ ہے، وہ موجوں سے لڑتا ہے، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتا ہے اور جو کچھ ہاتھ آتا ہے، اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اس کے اندر لالچ، طمع اور حرص جیسے منفی جذبات ناپید ہیں، البتہ اس میں ایک کمزوری ہے وہ یہ کہ وہ اپنی لالچی بیوی کی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہ ہر بار اپنی بیوی کے دکھائے ہوئے رستے پر چل دیتا ہے اور نتیجے میں اسے ہزیمت اور کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے مچھیرا اخلاقی سطح پر اپنی بیوی سے ڈٹ کر مقابلہ کیوں نہ کر سکا؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا خود مچھیرے کے پاس کوئی جواب نہ ہو گا۔

کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ مچھیرا بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو اس کی بیوی چاہتی تھی فرق تھا تو صرف اتنا کہ مچھیرا شعوری طور پر اپنی خواہشات سے آگاہ نہ تھا یا شاید اس میں

اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ انہیں لفظوں کا جامہ پہنا سکتا۔ اس کہانی میں مچھیرے کا کردار بیحد دلچسپ اور تجزیئے کا مستحق ہے۔

کہانی میں مچھیرے کی بیوی اور سنہری مچھلی کے درمیان ایک بار بھی براہِ راست مکالمہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کرداروں کے درمیان رابطے کا ذریعہ مچھیرا بنتا ہے۔ اس طرح کہانی میں جو واقعات بھی پیش آتے ہیں، اس کی ذمہ داری مچھیرے پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ پوری کہانی پڑھ جانے کے باوجود ہمیں مچھیرے سے نفرت نہیں ہوتی، اس پر غصہ نہیں آتا۔ وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہمدردی اور رحم کا مستحق ایک بے بس کردار بن کر ابھرتا ہے۔ اس کا کردار چابی سے چلنے والے کھلونے کا کردار ہے حالانکہ وہ اپنی ایک علیحدہ سوچ اور اپنا الگ نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اس کا بارہا وہ اظہار بھی کرتا ہے لیکن وہ اپنے نقطۂ نظر کو فیصلے کی شکل دینے اور پھر اس فیصلے کو نافذ کرنے کی قوت سے محروم ہے اور یہی وہ کمزوری ہے جو اُسے بیک وقت معصوم، مجرم اور مظلوم بناتی ہے۔ وہ مجرم یوں ہے کہ اس نے ایک ایسا عمل اختیار کیا جو اس کے خیال میں درست نہ تھا۔ اور معصوم اس طرح کہ اس کی بیوی نے اُسے اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا حالانکہ اس میں اس کی اپنی خواہش کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ مظلوم بھی ہے کیونکہ اُسے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ قصہ مختصر یہ کہ غریب مچھیرا اپنی نیکی، رحمدلی، شرافت اور قناعت پسندی کے باوجود ذہنی اور فکری سطح پر ایک مفعول کردار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہونے کے باوجود وہ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی صفات آدمی کو اخلاقی لحاظ سے مفعول بنا دیتی ہیں؟ یہ ہے وہ سوال جو اس کہانی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ آج ہمارے چاروں طرف ایسے ان گنت کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جو کہانی کے مچھیرے کی طرح شریف، نیک، رحمدل اور انسانی صفات رکھنے کے باوجود غیر مؤثر ہیں اور کھلونوں کی طرح بے بس! وہ معاشرے پر کوئی اثر نہیں رکھتے شر کی قوتیں مچھیرے کی لالچی بیوی بن کر دندناتی پھر رہی ہیں اور نیک دل مچھیرے خاموشی سے سارا منظر چپ چاپ دیکھے جا رہے ہیں۔

حادثے کے بعد

اب میں بہت مزے میں ہوں۔ یہاں کسی قسم کا شور و غوغا، روزمرہ کے مسائل، گھر والوں کی بک بک جھک جھک اور دفتر کی سیاست کچھ بھی تو نہیں ہے۔ بس ہر چیز آرام سے اور مزے سے ہے۔ کل رات میں کتنا پریشان تھا۔ پلاٹ کی آخری قسط جمع کرانے کی آخری تاریخ گزرنے والی تھی اور مجھے اس کی ادائیگی کیلئے قرض حاصل کرنا تھا اور جن صاحب نے یہ قرضہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے عین موقع پر صریح بے مروّتی کا مظاہرہ کر کے مجھے ٹال دیا اور میں اس پریشانی کے عالم میں تین ہٹی کے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ اچانک مجھے فضل یاد آگیا جو میرا بچپن کا دوست تھا اور آڑے وقتوں میں کئی بار میرے کام آیا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی میں ایک دم چل پڑا۔ میں نے سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور سامنے سے تیز رفتاری سے آتی ہوئی بس نے مجھے ٹکر مار دی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا؟ شاید میں گر پڑا۔ شاید بس مجھ پر سے گزر گئی۔ یقین مانیں، مجھے بالکل یاد نہیں کہ کیا کچھ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے اوسان بحال ہونے شروع ہوئے۔ میری آنکھیں اب بے نور طریقے سے کھلی تھیں۔ شاید میں مر چکا تھا۔ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے میرے نزدیک آئے۔ انہوں نے جھک کر مجھے دیکھا۔ ان میں سے ایک کا جملہ اب تک یاد ہے۔ اس نے کہا۔ "ارے! یہ تو مر گیا"۔ پھر لوگ جمع ہوتے گئے۔ ٹریفک رک گیا۔ میں بیچ سڑک پر پڑا تھا۔ "پکڑو، پکڑو" کی آوازیں آرہی تھیں۔ غالباً راہگیر حادثے کے ذمہ دار بس ڈرائیور کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا موٹا سا آدمی قریب آیا۔ اس نے کہا۔ "اس کی نبض دیکھنی چاہیئے، شاید زندہ ہو"۔ اس نے میری کلائی تھامی اور میری نبض

دیکھنے لگا، پھر اس نے مایوسی سے میری کلائی چھوڑ دی۔ اب میری کلائی سے وہ گھڑی غائب ہو چکی تھی جو میں نے اپنی کئی تنخواہوں سے رقم بچا کر خریدی تھی۔ سیاہ رنگ کے آدمی کو میں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، پھر دو کانسٹیبل آئے، انھوں نے جھک کر مجھے دیکھا۔ اب مجمع کو یقین ہو چکا تھا کہ میں مر گیا ہوں۔ قریب سے گزرنے والی گاڑیاں رُک رُک کر واقعے کے بارے میں پوچھتیں اور پھر آگے بڑھ جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر چادر ڈال دی گئی۔ اب میں بقیہ منظر بھی دیکھنے سے محروم ہو گیا۔ اب صرف میرے کانوں میں راہگیروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"جانے کون ہو گا بے چارہ؟"

"ارے اس کی جیب تو ٹٹولو، شناختی کارڈ سے پتہ نکال کر گھر پر تو اطلاع کرو۔"

میری جیب ٹٹولی گئی۔ جیب میں آٹھ روپے چار آنے اور دیگر چھوٹے موٹے کاغذات تھے، ان میں میرا پتہ بھی ہو گا لیکن مجھے یاد نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج میرا حادثہ ہو جائے گا اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں گھر سے ہی نہ نکلتا اور اگر مجھے مجبوراً نکلنا بھی پڑتا تو ضرور اپنا پتہ جیب میں رکھ کر نکلتا۔ آٹھ روپے چار آنے سے بھی میں محروم ہو گیا۔

مجھے اٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دیا گیا۔

غالباً بیس منٹ کے بعد کسی گاڑی کے ذریعے مجھے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ ایک نوجوان سا ڈاکٹر آیا۔ دو سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر نے میری موت کی تصدیق کی۔ ڈاکٹر سپاہی سے کہہ رہا تھا۔ "لاش نامعلوم ہے"۔ میں نے چاہا کہ بتا دوں کہ میں نامعلوم نہیں ہوں لیکن پھر میں نے سوچا کہ میں تو مر چکا ہوں اور مرنے والے بولا نہیں کرتے۔ مُردہ خانے میں پڑے پڑے میں خاصی بوریت محسوس کرنے لگا۔ پتہ نہیں میرے گھر والوں کو کب اطلاع دی جائے گی۔ اگر وہ جلدی سے آجاتے تو میری روانگی میں آسانی رہتی۔ میرے آنے میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ضرور بیوی پریشان ہوتی ہو گی۔ اس نے چھوٹے بچے کو ماموں کے یہاں بھیجا ہو گا اور وہاں سے بھی کوئی خبر نہ پا کر اس نے سوچ لیا ہو گا کہ میں اپنے کسی دوست کے یہاں بیٹھا گپیں لڑا رہا ہوں۔ میرے داہنی سمت میں بھی ایک آدھ لاشیں پڑی ہوں گی لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ میں بول نہیں سکتا ورنہ مُردہ خانے میں بھی ملک کے سیاسی

مسائل پر سیر حاصل گفتگو ہو سکتی تھی۔ حادثہ ساڑھے آٹھ بجے ہوا تھا اور اب رات کا ایک بج رہا ہے۔ کوئی بھی تو نہیں آیا۔ تھوڑی دیر قبل تک ایک ڈاکٹر کی آواز آ رہی تھی جو کسی کو چیخ چیخ کر ٹیلیفون پر بتا رہا تھا۔ "روڈ ایکسیڈنٹ، لاش نامعلوم، عمر ۴۵ سال"۔ ہو سکتا ہے کسی اخباری رپورٹر کو یہ معلومات فراہم کی جا رہی ہوں۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا۔ مُردہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایک فوٹو گرافر آیا، اس نے کیمرے کی آنکھ سے مجھے دیکھا، فلیش جھمجھایا اور تصویر اُتر گئی، لیکن فوٹو گرافر نے "یس ریڈی پلیز" اور "تھینک یو" کے الفاظ ادا نہیں کیئے۔ مگر کیوں؟ اوہ میں تو بھول ہی گیا کہ میں مر چکا ہوں۔ فوٹو گرافر ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا "سر! یہ تصویر اب کل ہی چھپ سکے گی، کیونکہ اخبار کی کاپی جا چکی ہے۔ میں تو یونہی گزر رہا تھا، سوچا آپ سے مل لوں۔" ڈاکٹر بولا: "یار اگر آج چھپ جاتی تو کم از کم اس کے گھر والوں کو پتہ چل جاتا۔ پتہ نہیں کون ہے؟"

اچھا تو میری تصویر اخبار میں چھپے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ میں اب ایک مشہور آدمی بننے والا ہوں۔ واہ، بہت خوب۔ زندگی میں تو کبھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ ارے ہاں، وہ ڈرائیور جانے کہاں گیا؟ جس نے مجھے ٹکر ماری تھی۔ کیا پولیس اسے پکڑے گی؟ کیا اُسے سزا ملے گی؟ لیکن مجھے اس سے کیا! میں تو ختم ہو چکا۔ میری کہانی تو ختم ہو چکی؟ رات گزر گئی، کوئی نہیں آیا۔ دن بھی گزر گیا اور کوئی نہیں آیا۔ اس مُردہ خانہ میں کتنی بُو ہے پتہ نہیں مجھے یہاں کب تک رہنا پڑے گا۔

اگلا دن طلوع ہوا تو دوپہر کے وقت میرے بچے اور دوسرے رشتے دار آئے وہ رو دھو رہے تھے، بیوقوف کہیں کے، مجھے خود اپنی موت کا افسوس نہیں تو وہ کیوں ڈھونگ کر رہے ہیں۔ میرا بیٹا مجھ سے لپٹ گیا، اور اب گھر جاؤں گا تو میری بیوی جو ہر شام منہ پھلائے بیٹھی ہوتی تھی اور آتے ہی مسائل کا پنڈورا کھول دیتی تھی، وہ بھی مجھ سے لپٹ کر روئے گی۔ اور یہ سب اس لئے لپٹ کر روئیں گے کہ ایک کمانے والا دنیا سے اٹھ گیا لیکن شاید یہ میری خود غرض سوچ ہے، ہو سکتا ہے وہ مجھ سے محبت بھی کرتے ہوں۔ دفتر میں ایک تعزیتی قرارداد بھی پاس ہو گی، میرے افسر کو بھی افسوس ہو گا لیکن ان لوگوں نے میری زندگی میں کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ کیا محبت صرف موت کے بعد پیدا ہوتی ہے؟

تالیوں کا شور

سرکس کا پہلا شو شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر تیز روشنی میں زرد کوٹ والا مسخرا ایک پہیئے کی سائیکل پر مزے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ خوبصورت، صحتمند اور معصوم بچے بیحد خوش تھے اور ہال میں دیر سے تالیاں گونج رہی تھیں۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب آپ کے سامنے عجیب و غریب کمالات دکھانے کیلئے جومو کماٹا آئیں گے۔ سبز رنگ کے چمکدار سوٹ میں جومو کماٹا آئے اور انھوں نے ہاتھ کی صفائی دکھانی شروع کی۔ ایک فیتہ کو آگ دکھائی، فیتہ جل کر راکھ ہو گیا۔ کماٹا نے اسی راکھ سے ایک نیا فیتہ پیدا کر کے دکھا دیا۔ اس کے کمالات پر تماشائی واقعی حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر لیں۔ پھر سانپوں کی ایک ملکہ آئی جس نے اپنے گلے میں کئی موٹے موٹے سانپ ڈال لئے۔ ہال میں کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ سانپوں کی ملکہ اسٹیج سے اُتر کر تماشائیوں کے درمیان آ گئی۔ بچوں نے سانپ کو چھو چھو کر تصدیق کی کہ کہیں ربڑ کا تو نہیں ہے۔

اس طرح کے کمالات جاری تھے کہ انٹرویل کا اعلان ہو گیا اور لوگ ہال سے نکل نکل کر باہر لان میں چائے اور سینڈوچز لینے آ گئے۔ اناؤنسر کی آواز گونجی:

"خواتین و حضرات! اب آپ ایک انتہائی خطرناک مظاہرہ دیکھیں گے۔ ہمارے نڈر اور بیباک فنکار لوٹی آرٹس کونسل کی اونچی چھت سے چھلانگ لگائیں گے۔ لوٹی اس وقت تیار کھڑے ہیں"۔

ان گنت سر اوپر اٹھ گئے۔ رات کی تاریکیوں میں ایک سایہ بلندیوں پر ساکت

کھڑا تھا۔ اف میرے خدا! سب نے دَم سادھ لیا۔ لوٹی کا پُراعتماد سَایہ لگا ہوں سے بہت اوپر لرزرہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے چہرے سے چادر کھینچی اور سیدھا گر گیا۔ اس کے گرنے کا انداز یوں تھا جیسے کوئی بُت یا مجسمہ اپنی بنیاد اُکھڑ جانے کے بعد صحیح سَالم حالت میں نشیب میں گرتا ہے۔

اس کے وجود نے زندگی سے موت کی سمت بڑھتے ہوئے دو تین قلابازیاں کھائیں اور پھر ۴ × ۴ کے اسٹیج پر زور سے اچھلا۔ وہ بچ گیا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر خوشی سے فاتحانہ انداز میں ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ لوگ جو لوٹی کو گرتے دیکھ کر جذبۂ رحم اور ہمدردی کے تحت اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے، انہوں نے مسرت سے دیوانہ وار تالیاں بجائیں

اس وقت اسٹیج سے ملحقہ چبوترے پر ہم تین دوست سرکس کے منتظم فیضان پیرزادہ کے ساتھ کھڑے انسانوں کے لئے برپا کئے گئے غیر انسانی تماشے کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ لوٹی دوڑتا ہوا اسٹیج کے پیچھے جانے لگا تو فیضان نے اُسے آواز دی اور ہم سے متعارف کرایا۔ ہمارے دوست نصرت نصراللہ اُس سے سوالات کرنے لگے اور وہ ہنس ہنس کر جواب دینے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے، اب تک لاولد ہے۔ بیوی اسٹیج کے پیچھے بیٹھی ہے۔ وہ ایسے خطرناک کھیل دیکھنے سے گریز کرتی ہے، اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ ہر روز دو بار اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر بار بچ نکلتا ہے۔ اس نے کہا کہ زندگی میں ان گنت مسائل ہیں، لیکن وہ ان مسائل کے لئے پریشان نہیں رہتا کیونکہ یہ پریشانیاں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا وہ چھلانگ لگانے سے پہلے عبادت کرتا ہے، دعا مانگتا ہے؟ وہ شاید سوال نہیں سمجھا، بولا۔ "چھلانگ لگانے سے پہلے میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور خود کو نشانے پر گرتا ہوا تصوّر کرتا ہوں اور یوں ٹھیک اسپنج کے گدّے پر گرتا ہوں، کیونکہ اندازے کی ذرا سی غلطی سے کھیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا ہے۔ وہ دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ شو کے شروع ہونے کا اعلان ہو گیا۔ شو کے دوسرے حصے میں لوٹی مختلف بہروپ بھر کر اسٹیج پر آتا رہا اور تماشائیوں کو ہنساتا رہا۔ شو کے خاتمے پر ہمیں باہر نکلنے میں

تاخیر ہوگئی لیکن گیٹ سے نکلتے وقت ہم نے دیکھا کہ لٹوٹی گدے میں بھرے ہوئے اسپنج کے ٹکڑوں کو لمبی سی چھڑی چبھو چبھو کر درست کر رہا ہے اور اس کے نزدیک ہی اس کی موٹی سی بیوی خاموش کھڑی ہے۔

ہر روز سرکس کے دو شو ہوتے ہیں۔ اس دلچسپ شو سے لطف اندوز ہونے کیلئے سینکڑوں بچے اپنے والدین کی انگلیاں پکڑے آتے ہیں۔ جہاں یہ لاولد جوڑا اُن کی خوشی اور اپنے پیٹ کے لئے موت کے دروازے کو چھو کر واپس لوٹتا ہے۔ اس کی بیوی جانتی ہے کہ جس روز لٹوٹی کا اندازہ غلط ثابت ہوگیا، اس کی اپنی زندگی میں صرف تماشائیوں کی تالیوں کا شور باقی رہ جائے گا بے معنی اور مضحکہ خیز شور۔!

پھولن دیوی

پھولن دیوی ڈاکو نہ بنتی تو برصغیر کی ان عورتوں کی عظیم اکثریت کا حصّہ ہوتی جو ساری عمر اپنی قسمت پر روتی کڑھتی، چھ سات مرگھلے بچّے پیدا کر کے چل بستی ہیں، ان کی تقدیر شوہر کی جھڑکیاں، ساس کی گالیاں سننا اور دھوئیں بھرے باورچی خانے میں روٹیاں سینکنا اور پلّو سے آنسو پونچھنا ہے، ان عورتوں کی کوئی انجمن، یونین یا ایسوسی ایشن نہیں ہے، انہیں اپنے مطالبات کا بھی علم نہیں۔ یہ تو بس خاموشی سے دنیا میں آتی اور چلی جاتی ہیں شاید ان کی حیثیت آبادی میں اضافے کے آلۂ کار سے زیادہ نہیں۔

پھولن دیوی کے مظالم کو جان کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان مظلوم عورتوں کے سینے میں کتنی آگ بھری ہے اور اگر وہ کبھی انتقام لینے پر اُتر آئیں تو گاؤں کے گاؤں اور بستیاں کی بستیاں ویران کر سکتی ہیں۔ یہ عورتیں برصغیر کے ہر خطّے میں آباد ہیں اور آئے دن اخبارات میں ان کی خودکشی یا تشدد کے ذریعے ہلاک ہونے کی خبریں چھپتی رہتی ہیں اور ان میں سے جو بچ جاتی ہیں، ان میں سے ایک آدھ پھولن دیوی بن جاتی ہے۔

(۱۳ فروری ۸۳ء)

فری تھنکنگ

میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں کہ چند بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں، دو مزدور ایک مکان تعمیر کر رہے ہیں اور ایک کبوتر فضا میں نہایت مسخرے پن سے قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کرکٹ کھیلنے والے بچے ہر وقت کھیلتے ہی رہتے ہیں، نہیں معلوم پڑھنے کس وقت ہیں؟ کئی برسوں کا میرا مشاہدہ ہے کہ یہ صبح کو کنچے کھیلتے ہیں، دوپہر کو کرکٹ، شام کو بیڈمنٹن اور رات کو ٹی وی دیکھتے ہوں گے۔ بچوں کا ایک گروپ تو دیکھتے دیکھتے جوان ہو گیا لیکن نہ معلوم کہاں سے تقریباً اتنے ہی بچوں کا ایک اور گروپ آ گیا۔ بچے پیدا ہو ہو کر آتے جاتے رہے ہیں اور کھیل ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ کھڑکی سے میں نے دیکھا ہے کہ مزدور مکان کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ یہ مکان گزشتہ کئی سال سے مسلسل تعمیر ہی کے مراحل میں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مزدوروں کی ساری زندگی اسی ایک مکان کی تعمیر میں گزر جائے گی۔ اس مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک مسجد ہے، اس کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ دس برس گزر گئے، مسجد کے نمازی ہر نمازِ جمعہ کو "چندہ برائے تعمیرِ مسجد" کا نعرہ سن کر اپنی اپنی جیبوں سے حسبِ استطاعت رقم اگل دیتے ہیں۔ مسجد کی آمدنی کے ذرائع میں اس کے ساتھ ملحقہ کرائے کی دکانیں بھی شامل ہیں لیکن مسجد کی تعمیر مکمل ہونا تو دور کی بات ہے، مسجد میں کوئی نمایاں تبدیلی بھی نہیں آئی ہے۔ نمازی بور ہو چکے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ جمعہ کا خطبہ سنتے ہوئے "چندہ برائے تعمیرِ مسجد" کا نعرہ سن کر اب بیشتر نمازی جنبش بھی نہیں کرتے۔ مسجد اور مکان کی تعمیر کب مکمل ہو گی؟ کوئی نہیں جانتا۔ فضا میں قلابازیاں

کھانے والا کبوتر اب تک قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کیا یہ اپنے اگلے جنم میں سیاستداں بننے والا ہے؟ یہ کتنا خوش نصیب کبوتر ہے جس کی قلابازیوں پر کوئی معترض نہیں! اگر یہ اگلے جنم میں سیاستداں بنا تو اسے اندازہ ہوگا کہ کبھی کبھی قلابازیوں کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

بچے، مزدور اور کبوتر، ان تینوں میں قدرِ مشترک لاعلمی ہے۔ بچے اپنے کھیل، مزدور اپنے مستقبل اور کبوتر اپنے مقصدِ زندگی سے لاعلم ہے۔ لاعلمی میں نجات ہے۔ میں اپنی کھڑکی سے دنیا کا بہت چھوٹا، حقیر اور معمولی سا گوشہ دیکھتا ہوں۔ اس گوشے میں زندگی سانس لیتی، ہنستی اور اداس رہتی ہے۔ ایک شخص کتنا ہی جان لے، پھر بھی وہ ان گنت حقائق سے بے خبر رہتا ہے۔ اگر لاعلمی میں نجات نہ ہوتی تو بچے کھیل سے بیزار ہو جاتے۔ مزدور مکان کی تعمیر کو ادھورا چھوڑ کر اپنی راہ لیتے اور کبوتر وجود کے مسئلے پر غور و خوض کرنے لگتا۔ کھڑکی سے سرکلر ریلوے کی پٹریاں دھوپ میں چمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس پر ابھی ابھی ایک ٹرین گزری ہے۔ ٹرین کے ڈبے خالی تھے۔ صبح کو ان ڈبوں میں تل دھرنے کو جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ یہاں کے باشندے صبح کا ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اس کا تعاقب کرتے ہیں تاکہ دفتر وقت پر پہنچ سکیں۔ دفتر وقت پر پہنچنا دفتری فرائض میں شامل ہے لیکن نہ پہنچنے کی صورت میں نقصان بھی نہیں ہوتا۔ بیوی بیمار تھی، بس نہیں ملی، بچے کا معدہ خراب ہو گیا تھا۔ ان گنت حیلے بہانے ہیں نقصان سے بچنے کیلئے جھوٹ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ کہتے ہیں ایک جھوٹ کی وجہ سے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لیکن ایک سچ کے بعد سو جھوٹ بھی تو بولے جا سکتے ہیں۔

ایک آدمی دن بھر سچ ہی بولتا ہے۔ جھوٹ کی ضرورت تو ہنگامی حالات میں ہوتی ہے عام حالات میں تو سب ہی سچ بولتے ہیں۔ میں آیا۔ میں گیا۔ میں نے کھانا کھایا۔ میں نے بچے کو پیار کیا۔ میں نے فائل پر دستخط کر دیئے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں چائے پی چکا ہوں۔ میں اپنے بال کٹواؤں گا۔ آدمی دن بھر اسی قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ سب سچ نہیں؟ بھلا یہ ممکن ہے کہ کوئی بنا تھکے سارا وقت دروغ گوئی کرتا رہے؟

آدمی جب پہلی بار جھوٹ بولتا ہے تو اس کی کان کی لویں سُرخ ہو جاتی ہیں اور آواز میں خوف کا سا احساس پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب وہ پہلی بار سچ بولتا ہے تو اُسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ دونوں کان مزے میں اپنی جگہ پر جمے رہتے ہیں اور ہوا کے تیز جھونکے سے اتفاقاً پنکھے کی طرح ہل جاتے ہیں البتہ سچ بولنے کا ردِعمل بھی پہلے کانوں ہی پر ہوتا ہے اور وہ سُرخ ہو جاتے ہیں۔ کان سُرخ کیوں ہوتے ہیں؟ شاید وہ حساس زیادہ ہوتے ہیں! مگر حساس تو دل بھی ہوتا ہے' دونوں میں فرق ہے تو بس اتنا کہ کوئی بھی تلخ، ترش یا شیریں بات کانوں کے ذریعے داخل ہوتی ہے، مگر وہاں قیام نہیں کرتی' وہ دل میں اُتر جاتی ہے اور وہیں گھر بنا لیتی ہے۔ جب تند و تیز بات کان میں داخل ہوتی ہے تو وہ لال ہو جاتے ہیں۔ غالباً اسی لئے کان تو بہت جلد نارمل پوزیشن میں آجاتے ہیں مگر دل جھنجھلاہٹ کا شکار بجھا ہوا رہتا ہے۔ بیشک انسانوں کے کان ان کے دل کے مقابلے میں زیادہ مطمئن پائے گئے ہیں۔ ایک روز دل نے کان سے کہا۔

"دیکھو، میں انسان کے اندر کتنی محفوظ حالت میں رہتا ہوں اور تم ہر وقت باہر کی گرمی، سردی اور موسموں کی بے رحمی کا شکار حالتِ عدم تحفظ میں رہتے ہو۔ مجھے تم پر بہت رحم آتا ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہاری خاطر تمہاری جگہ لے سکتا ہوں"۔

کان نے ہنس کر کہا: "تمہارا بہت بہت شکریہ! میں اپنی موجودہ حالت میں مطمئن ہوں، کیونکہ میرا دکھ عارضی ہے اور تمہارا ابدی۔ میں اپنی اذیت تمہیں منتقل کر دیتا ہوں۔ میری مثال اُس قلی کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کیلئے سامان ڈھو کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن سامان کا مالک اپنے سامان کی حفاظت کے عذاب میں ساری زندگی مبتلا رہتا ہے"۔

میں نے یہ سب کچھ اپنی کھڑکی سے دیکھا اور سوچا ہے۔ آج کے اخبارات میں وہی گھسی پٹی خبریں تھیں۔ افسوس مجھے اپنے کالم کیلئے کوئی موضوع نہ مل سکا۔

(۷، مئی ۸۲ء)

ایک سیاستداں سے غیر رسمی انٹرویو

آپ سیاست میں کیوں آئے ہیں ؟

پھر کہاں جاتا۔؟

کہیں بھی۔!

جہاں بھی جاتا آپ یہ پوچھنے آجاتے کہ "یہاں کیوں آئے ہیں"۔

تو پھر بتادیں ناکہ سیاست میں کس مقصد کی خاطر آئے ہیں ؟

(ناراض ہوکر) بالنسری بجانے۔

نیرو نے بھی بالنسری بجائی تھی جب روم جل رہا تھا۔

بے سُری بالنسری بجانے سے یہی ہوتا ہے۔

کیا آپ سریلی بالنسری بجانے پر یقین رکھتے ہیں۔

یقین نہیں رکھتا، بجاتا ہوں اور میرے ساتھ بہت سے سیاستداں بجاتے ہیں۔

کیا وہ آپ کے دوست ہیں ؟

جی ہاں، ان کا خیال یہی ہے !

آپ کا کیا خیال ہے ؟

میں سیاست میں صرف سیاست کا قائل ہوں۔

آپ لوگوں کی دوستیاں اتنی جلدی تبدیل کیوں ہوجاتی ہیں۔

حالات بھی تو اتنی جلدی تبدیل ہوجاتے ہیں۔

کیا آپ بیان سوچ سمجھ کر دیتے ہیں۔

اگر سوچ لوں تو بیان ہی کیوں دوں!
بیان دینے سے قبل یا بعد میں آپ کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔؟
آپ بیان دینے کی شرط کیوں لگاتے ہیں۔ میں عام زندگی میں بھی اس قسم کی
ذہنی ورزش ناپسند کرتا ہوں۔
جبھی آپ کی صحت قابلِ رشک ہے!
آپ سیاست میں آجائیں آپ کی صحت بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔
کیا سیاست میں بہت مزے ہیں۔؟
جی ہاں آجکل کی سیاست میں۔
مگر سیاست پر تو پابندی ہے۔؟
پابندی تو شراب پر بھی ہے۔!
سیاست سے شراب کا تعلق؟
دونوں نشہ آور ہیں۔
بہکنے کا امکان کس میں زیادہ ہے۔؟
حکومت میں، اس کا نشہ دونوں سے بڑھ کر ہے۔
آپ حکومت میں کب آجائیں گے؟
جب مجھ سے کہا جائے گا۔
کون کہے گا؟
حکومت۔
اگر آپ کو اسی وقت حکومت کی پیشکش ہو تو آپ قبول کر لیں گے؟
اس وقت تو میں انٹرویو دے رہا ہوں۔
پھر بھی فرض کر لیجئے؟
(بُرا مان کر) کیوں مذاق کر رہے ہیں۔؟
آپ نے بچپن میں کبھی سوچا تھا کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟

میں نے کبھی نہیں سوچا لیکن میرے والدین کو اندازہ ہو گیا تھا۔

وہ کیسے ؟

ایک بار میرے والد صاحب نے میرا رجحان جاننے کیلئے میرے سامنے ایک کتاب، ایک روپے کا نوٹ اور ایک سیب رکھا اور والدہ سے کہا کہ دیکھو اگر یہ لڑکا کتاب اٹھائے گا تو پروفیسر بنے گا، روپیہ جیب میں رکھے گا تو تاجر بنے گا اور سیب کھائے گا تو سمجھ لو زمینداری کرے گا۔ میں اس "سازش" سے بے خبر تھا اس لئے میں نے نوٹ جیب میں رکھ لیا اور سیب کھانے کے بعد بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا۔ میری والدہ نے پوچھا۔ "بھلا بتاؤ اب ہمارا بیٹا کیا بنے گا؟" "سیاستداں" والد نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں یہ لطیفہ پڑھ چکا ہوں۔

یہ لطیفہ نہیں حقیقت ہے اور وہ بچہ میں ہی تھا۔

واقعی ؟

اس میں یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے۔؟

آپ سچ مچ خوش قسمت ہیں۔

(اخلاقاً) آپ بھی تو ہیں !

میں کیسے ہوں ؟

آپ کو مجھ سے انٹرویو کا جو موقع ملا۔

آپ عوام میں کتنے مقبول ہیں؟

یہ اہم سوال ہے۔ میں اس کے جواب میں آپ سے ایک اور سوال کرتا ہوں، یہ بتائیے کہ ایک ایسا ہیرو جس کی فلم ابھی ریلیز نہ ہوئی ہو، اس کے متعلق آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ عوام میں کتنا پسند کیا جاتا ہے۔

ہاں، لیکن فرض کیجئے فلم ریلیز ہوتی ہے اور پٹ جاتی ہے۔ پھر آپ کیا کہیں گے ؟

یہ ایک مفروضہ ہے، اس کے جواب میں دوسرا مفروضہ یہ بھی ممکن ہے کہ فرض کیجئے فلم چل جاتی ہے اور ہیرو ہٹ ہو جاتا ہے۔ پھر آپ کے اعتراض کا کیا بنے گا۔

ہٹائیے اس بحث کو۔ یہ فرمائیے کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال آپ کیلئے کس حد تک موزوں ہے۔؟

موجودہ سیاسی حالات مجھ سے زیادہ حکومت کیلئے منفعت بخش ہیں۔

حالات آپ کے حق میں کب ہوں گے؟

جب میں حکومت میں آجاؤں گا۔!

اچھا! اب چند عمومی سوالات!

جی ہاں لیکن میں اُن کے خصوصی جوابات دوں گا۔

آپ کی ناپسندیدہ ترین کتاب؟

وہائٹ پیپر۔

ناپسندیدہ ترین آدمی؟

وہ جو مجھ سے پارٹی میں الیکشن کا مطالبہ کرے۔

وہ خواب جو آپ اکثر دیکھتے ہوں۔

چالیس توپوں کی سلامی کے بعد گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہا ہوں۔

وہ دن جب آپ اُداس رہتے ہیں؟

جس دن اخبار میں میری تصویر یا بیان نہ چھپے۔

وہ لمحہ جب آپ نے سیاست سے کنارہ کشی کا سوچا ہو۔

اخبارات میں کرکٹرز کے معاشقے اور رنگین ٹرانسپیرنسیاں چھپی دیکھ کر اکثر یہی سوچتا ہوں۔

وہ یادگار پریس کانفرنس۔!

ہر وہ پریس کانفرنس جسے اخبار والے "پرہجوم پریس کانفرنس" قرار دیں۔

وہ رات جب آپ کی نیند اُڑ گئی تھی؟

جب اخبارات پر سیاستدانوں کے بیانات چھاپنے کی پابندی لگ گئی تھی۔

آپ کا پسندیدہ ترین مشغلہ؟ (بیانات دینے کے علاوہ)

حکومت سے مذاکرات۔

زمانہ طالب علمی کا کوئی یادگار واقعہ !
میٹرک کے امتحان میں کامیابی۔
کوئی واقعہ جب آپ نے کسی غریب آدمی کی مدد کی ہو۔؟
ایک غریب آدمی میرے پاس مدد کے لئے آیا تھا۔ اس کی حالت سے میں بہت متاثر ہوا اور پھر اگلے دن غریبوں کی حمایت میں ایک زوردار بیان دیا۔
دولت مندوں سے کوئی شکایت ؟
دھمکی کے بغیر پارٹی کو مالی امداد نہیں دیتے۔
بین الاقوامی سیاست پر آپ کا تبصرہ ؟
دنیا کو ایک مردِ آہن کی ضرورت ہے۔

(۲۱ر نومبر ۸۳ء)

کبوتروں کی شاعری

شاعروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو شاعر ہوتے ہیں دوسرے وہ جو شاعر کہلاتے ہیں۔ جاذب قریشی کا شمار دوسرے قسم کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ بڑی محنت سے شاعر بنے ہیں۔ اسی لئے ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے کیونکہ شاعر ہونے کے مقابلے میں شاعر بننا زیادہ بڑی بات ہے جو شاعر ہوتے ہیں، انہیں کم لوگ جانتے ہیں لیکن جو شاعر کہلاتے ہیں، ان سے سبھی واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ٹی وی پر، ریڈیو پر مشاعروں میں آتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں اور پھر یہ بھی تو سوچئے کہ جو پیدائشی شاعر ہوتا ہے، اس کے لئے تو شاعری مفت کی دولت ہوتی ہے اس کے برعکس کارنامہ تو وہ لوگ کرتے ہیں جو شاعر نہیں ہوتے، محنت مشقت کر کے شاعر بن جاتے ہیں۔ شاعر ہونا ایک وہبی صلاحیت ہے اور شاعر بننا یا کہلانا اکتسابی۔ جاذب قریشی کیلئے ہمارے دل میں عزت و احترام کے جذبات اسی لئے موجزن رہتے ہیں کہ ہمیں علم ہے کہ وہ شبانہ روز محنت کے نتیجے میں بالآخر شاعر بننے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

جاذب قریشی ہمارے نہایت محترم دوست ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے باوجود ہماری اور ان کی دوستی اس معاہدے کی وجہ سے برقرار ہے کہ وہ اپنی کسی ملاقات میں ہمیں اپنی کوئی غزل یا نظم نہیں سنائیں گے۔ ان کا شعری مجموعہ "پہچان" آب و تاب کے ساتھ چھپا تو انہوں نے ازراہِ عنایت ایک نسخہ ہمیں بھی عطا کیا اور حکم دیا کہ ہم کتاب کے بارے میں بذریعہ کالم اپنی رائے سے مطلع کریں۔ ہم نے اس شرط کے ساتھ تعمیلِ ارشاد کی ہامی بھر لی کہ لکھنے کے لئے ان کا مجموعہ پڑھنا ہمارے لئے قطعی ضروری نہ ہو گا۔ اس لئے کہ کسی کتاب پر بہترین

تبصرہ وہی ہوتا ہے جو اس کے مطالعے کے بغیر کیا جائے۔ ہم "پہچان" پر جلد ہی کالم لکھ دیتے لیکن ہُوا یوں کہ ایک دن ہم نے دھوکے میں اس مجموعے کا مطالعہ کر لیا دھوکے میں اس طرح کے ہم نے اپنی شیلف سے "پہچان" کے ٹائٹل سے مشابہ ایک اور کتاب پڑھنے کیلئے اٹھائی اور جب پوری کتاب پڑھ گئے تو انکشاف ہوا کہ ہم غلطی سے جاذب قریشی کا مجموعہ پڑھ گئے ہیں۔ ہر غلطی کی آدمی کو کوئی نہ کوئی سزا تو ملتی ہے ہمیں یہ سزا ملی کہ ہفتوں شاعری کی کسی کتاب کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوئی۔ ظاہر ہے اچھی شاعری کا اپنا ایک علیحدہ نشہ ہوتا ہے۔

جاذب قریشی کی شاعری کا نشہ ہمارے علاوہ عزیز حامد مدنی اور جمیل الدین عالی جیسے نامور شعراء پر بھی طاری ہوا اور وہ "پہچان" کی تقریب رونمائی میں ان کی شاعری کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوئے کہ جمال احسانی کو احتجاجاً کرسی پر کھڑے ہو کر چیخنا پڑا۔ خیر ادب میں ایسی سرگرمیاں تو آئے دن دیکھنے میں آتی ہیں۔ جاذب صاحب کی شاعری کے ان گنت اسرار و رموز ہم پر اس خط کے ذریعے وا ہوئے جو ہمیں پچھلے دنوں موصول ہوا۔ اس خط میں عزیز آباد کراچی کے ایک نوجوان سید مسعود احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ جاذب قریشی کو اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں اور بی ایس سی کا طالب علم ہونے کے باوجود شعر و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ مسعود احمد نے خط میں اپنی ایک مشکل بھی بیان کی اور وہ یہ کہ انہیں جاذب قریشی کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آ سکا کئی ادب شناس حضرات سے رابطہ قائم کیا مگر وہ بھی کوئی مدد نہ کر سکے لہٰذا انہوں نے گزارش کی ہے کہ ہم انہیں شعر کا مطلب سمجھا دیں اور اگر نہ سمجھا سکیں تو جاذب قریشی کا پتہ ارسال کر دیں۔ شعر یہ ہے :

ہم تو سورج کے انتظار میں تھے
نیند کیا مانگتے کبوتر سے !

میاں مسعود کے خط کی وصولی کے بعد ہم نے سنجیدگی سے اپنے اعمال کا جائزہ لیا کہ آخر ہماری کس حرکت سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم جاذب قریشی کی غزلوں

کے شارح ہیں۔ چونکہ ہم اس کا سراغ لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ اس لئے میاں مسعود سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اگلے خط میں اس راز پر سے ضرور پردہ اٹھائیں۔

جدید شعرا کی شاعری ہمیں ویسے بھی کب سمجھ میں آئی ہے کیونکہ اگر آجاتی تو ہم کسی کالج میں اُردو کے لیکچرار نہ ہوتے۔ ہاں مسعود احمد کی سہولت کیلئے اتنا عرض کئے دیتے ہیں کہ جدید شاعری کی تعریف یہ ہے کہ اس میں معنویت جتنی کم ہوگی، شاعری اتنی ہی جدید ہوگی۔ جاذب قریشی کا یہ شعر بھی جدید حسیت کا ترجمان ہے۔ اس شعر میں کبوتر علامت کے طور پر آیا ہے اور شعر کی معنویت کو چونچ میں دبائے، سر نیہوڑائے غٹر غوں غٹر غوں کر رہا ہے۔ اس لئے اس میں معنی ڈھونڈنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ کبوتر کی چونچ کی طرف رجوع کریں، انشاءاللہ آپ کی مشکل آسان ہوجائے گی۔ ویسے شعر کے معاملے میں ہماری رائے ہر گز صائب نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہماری ملاقات جاذب قریشی صاحب سے ہوئی تو ہم نے ان سے شعر کا مطلب پوچھا، جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ شعر میں کبوتر کو پیغامبر کے روایتی معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ ایک قنوطی، مطمئن اور بے نیاز کبوتر ہے جو اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ اس طرح شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "ہم رات کی تاریکی میں سورج کا انتظار کر رہے تھے" اس لئے کبوتر جیسے مطمئن پرندے سے آرام اور سکون کیا طلب کرنا۔ (خدا بہتر جاننے والا ہے)

علامہ اقبال، شاہین سے متاثر تھے جاذب قریشی کبوتر سے متاثر ہیں، شاہین اور کبوتر میں بس ذرا طاقتِ پرواز ہی کا فرق ہے، ورنہ ہیں تو دونوں پرندے بلکہ کبوتر اس اعتبار سے شاہین پر فوقیت رکھتا ہے کہ وہ انڈہ دیتا ہے جبکہ ہماری اطلاعات کے مطابق اقبال کے شاہین نے آج تک انڈہ نہیں دیا اور دیا ہوتا تو علامہ کی شاعری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں شاہین کے حوالے سے بکثرت اشعار ملتے ہیں۔ جاذب قریشی کے اشعار میں جابجا کبوتروں پر مضمون باندھا گیا ہے۔ مثلاً

ے منڈیروں سے کبوتر اُڑ رہے ہیں
کہ سایے ہیں تیری انگڑائیوں کے

ع دو کبوتر ہیں کہ پر جوڑ کے اُڑ جاتے ہیں

جاذب قریشی کی شاعری میں قید کبوتروں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اگر ان کے مجموعے کا اشتہار یوں دیا جاتا کہ "اس کتاب کے اندر کبوتر بھی دستیاب ہیں" تو کتاب ہاتھوں ہاتھ بکتی۔ بالخصوص کبوتروں میں بہت مقبول ہوتی۔ جاذب قریشی نے شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے کبوتر نہایت قنوطی ہیں، پوائنٹ آف آبجکشن یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کثرت سے سیاسی کبوتر، اقتصادی کبوتر، اخلاقی کبوتر اور منافق کبوتروں کی بھی بہتات ہے۔ سو جاذب نے ان سارے کبوتروں کو نظر انداز کر کے صرف قنوطی کبوتروں پر کیوں قناعت کی۔ خیر یہ جاذب قریشی اور کبوتروں کا معاملہ ہے۔ ہم اس معاملے میں دخل دَرمعقولات کر کے جاذب قریشی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اگر ہم سے کبوتر ناراض ہو گئے تو بازار سے اور کبوتر لاسکتے ہیں۔ جاذب قریشی خفا ہو گئے تو ہم ان کا متبادل کہاں سے تلاش کریں گے۔

آخر میں ہم صرف اتنی سی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ یہ کالم ہم نے جاذب قریشی کی محبت میں لکھا ہے۔ حاسد اور افترا پرداز اگر اسے مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کریں گے تو مجبوراً ہمیں بتانا پڑے گا کہ ہم جاذب قریشی سے اس کے لکھنے کی پیشگی اجازت لے چکے تھے۔

(۳ر دسمبر ۸۳ء)

مُونا اور چاند گرہن

مونا نے پوچھا :

"بھائی جان، یہ چاند آہستہ آہستہ غائب کیوں ہوتا جا رہا ہے۔؟"

"مونا، چاند کو گرہن لگ رہا ہے۔"

"چاند کو گرہن کیسے لگتا ہے ؟"

"جب زمین گردش کرتے کرتے چاند اور سورج کے درمیان آجاتی ہے تو چاند کو گرہن لگنا شروع ہو جاتا ہے۔"

"بھائی جان! زمین گردش کرتی ہی رہتی ہے، چاند کو گرہن کیسے لگ جاتا ہے۔"

"اوہ تم بہت بیوقوف ہو مونا، ٹی وی دیکھنے کے باوجود تمہیں عقل نہیں آئی۔ اب اس بات کو تم یوں سمجھو کہ چاند جو ہے نا، اس کی اپنی روشنی تو کوئی ہوتی نہیں ہے۔"!

"کیوں چاند کی اپنی روشنی کیوں نہیں ہوتی ؟"

"بس نہیں ہوتی، اللہ میاں کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہی ہو گی، جس کی وجہ سے انہوں نے چاند کو روشنی سے محروم رکھا ہے۔"

"اچھا تو پھر ؟"

"پھر یہ کہ چاند کو روشنی سورج سے ملتی ہے اور وہ اسی کی وجہ سے روشن رہتا ہے اور جب ان دونوں کے درمیان زمین ناچتی ہوئی آجاتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر پڑنے لگتا ہے اور یوں چاند ڈوبتا، غائب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔"

"اچھا اگر سورج اور چاند کے درمیان آکر زمین کی گردش رک جائے تو پھر چاند دوبارہ

کبھی روشن نہیں ہو سکے گا۔؟"
"ہاں لیکن زمین کی گردش کبھی رک ہی نہیں سکتی۔!"
"لیکن فرض کیجئے اگر ایسا ہو جائے تو؟"
"اتنی احمقانہ بات فرض کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے مونا؟"
"اچھا یہ بتائیے اگر سورج چاند کو اپنی روشنی دینے سے انکار کر دے پھر کیا ہوگا؟"
"مونا' اوّل تو سورج ایسا کرے گا نہیں اور دوم اگر اس نے ایسا کیا تو پھر زمین پر چاند کبھی نہیں چمک سکے گا اور لوگ سورج سے نفرت کرنے لگیں گے"۔
"تو کیا لوگ محض چاند کی وجہ سے سورج سے نفرت کرنے لگیں گے؟"
"ہاں مونا' کیونکہ چاند سے لوگ پیار کرتے ہیں!"
"کیوں صرف چاند سے کیوں؟"
"اس لئے کہ چاند ہمیشہ زمین پر مہربان رہا ہے"۔
"اور سورج؟"
"سورج صرف سردیوں میں مہربان رہتا ہے۔ گرمیوں میں جانے کیوں اُسے جلال آجاتا ہے اور وہ سب کیلئے باعثِ تکلیف بن جاتا ہے لیکن چاند سردیوں اور گرمیوں میں خزاں اور بہار میں اور موسلادھار بارشوں کے بعد اپنی دودھیا روشنی لئے درِ تیچے کے باہر' آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں سفر کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ جلال میں نہیں آتا، اس کی روشنی کبھی کسی کیلئے باعثِ آزار نہیں بنتی"۔
"لیکن وہ روشنی تو سورج ہی سے حاصل کرتا ہے نا؟"
"ہاں اُسے روشنی تو سورج ہی سے ملتی ہے مگر چاند کا اپنا مزاج ہے' اس کا اپنا ایک دل ہے جس میں کسی کو دکھ پہنچانے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے شاعروں نے ہمیشہ چاند کو اپنا دوست اور رازداں بنایا ہے"۔
"بھائی جان! اگر چاند اتنا ہی اچھا ہے تو پھر لوگ چاند کو کیوں بھول گئے ہیں؟ اب تو کوئی بھی اسے نہیں دیکھتا، کوئی بھی اس کا تذکرہ نہیں کرتا۔؟"

"اصل میں لوگ مصروف ہو گئے ہیں مونا' وہ دن بھر دفتروں میں کام میں جُتے رہتے ہیں اور رات میں آکر ٹیلیویژن کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر شہر میں اتنی اونچی اونچی عمارتیں بن گئی ہیں اور اتنے نیون سائن جل اٹھے ہیں کہ چاند لوگوں کی زندگیوں سے نکل گیا ہے' اب وہ کب نکلتا ہے اور کب ڈوب جاتا ہے، کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔"

"تو کیا پہلے لوگ کام نہیں کرتے تھے' وہ پہلے مصروف نہیں رہتے تھے۔؟"

"نہیں وہ پہلے بھی کام کرتے تھے لیکن کام کے دوران اُن کے دلوں میں چاند اور اپنے بچے کی محبت کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی تھی اور وہ ہر شام گھر لوٹ کر اپنے بچوں کو پیار کرتے تھے اور جب چاند نکلتا تھا وہ اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر چاند کی طرف اشارہ کر کے نظمیں اور گیت گاتے تھے۔"

"اچھا کیا واقعی"؟ مونا حیران ہوئی۔

"ہاں واقعی، وہ کہتے: "مُنّے آؤ میں تمہیں چاند سے ملاؤں"۔

پھر وہ گاتے:

چندا ماما دُور کے	بڑے پکاویں پُور کے
آپ کھائیں تھالی میں	مُنّے کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ	مُنّا گیا رُوٹھ

"اور پھر مُنّا روٹھ جاتا تھا؟"

"نہیں وہ ہنس پڑتا تھا' کھلکھلا کر' اور پھر سو جاتا تھا اور رات خواب میں چاند اور مُنّے کی ملاقات ہوتی تھی اور یوں بڑا ہو کر مُنّا بھی چاند کی طرح نیک دل بننے کی کوشش کرتا تھا' کسی کو نقصان نہ پہنچانا' دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا۔ وہ ایسی ہی عادات کو اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔"

"لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"ہاں مونا' اب یہ ساری باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اب چاند اکیلا رہ گیا ہے۔ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرہن لگ گیا ہے۔ وہ سب کا دوست ہے' لیکن اس کا کوئی دوست نہیں۔"

"بھائی جان! کیا میری چاند سے دوستی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں!"

"بس ٹھیک ہے!" مونا نے خوش ہو کر کہا۔ "کل رات چاند نکلے گا تو میں اس سے دوستی کروں گی اور وہی نظم گاؤں گی لیکن....." وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"لیکن فلیٹ کی نچلی منزل سے تو آسمان ہی دکھائی نہیں دیتا۔ چاروں طرف بلڈنگیں کھڑی ہیں۔ چاند سے میری دوستی کیسے ہو گی؟"

مونا اداس ہو گئی۔ مجھے معلوم ہے کہ مونا کی اُداسی مستقل نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں اچھلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں جا کر "الف نُون" دیکھنے لگے گی...... کیا چاند اور مونا کی دوستی کبھی نہیں ہو سکے گی۔؟

تو پھر ٹھیک کیا ہے؟

رات کافی گزر جانے کی وجہ سے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ صدر کا علاقہ تقریباً سنسان تھا۔ بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں، البتہ اکا دکا پان کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اسٹاپ پر ایک شخص اپنے کانوں کے گرد مفلر لپیٹے کھڑا تھا۔ ہوا کا سرد جھونکا آیا تو میں نے بھی جیکٹ کے کالر کھڑے کر دیئے اور اپنی موٹر سائیکل کو برا بھلا کہنے لگا جس نے بے موقع دھوکا دیدیا تھا۔ مفلر والا شخص ٹہلتا ہوا میرے نزدیک آ گیا۔

"کیوں بھائی صاحب! آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"میں نے مشتبہ نظروں سے اُسے گھورا۔ حلقے میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور مفلر کی وجہ سے ادھ کھلا چہرہ بے ضرر سا محسوس ہوا۔ میں نے اسے اپنی منزلِ مقصود سے آگاہ کیا۔

"جانا تو میں نے بھی اُدھر ہی ہے مگر جائیں کیسے؟"

"دیکھیں شاید تھوڑی دیر میں کوئی منی بس یا ٹیکسی اِدھر آ نکلے۔"

"صاحب کراچی میں تو ساری رات بسیں چلنی چاہئیں لیکن آجکل تو بارہ بجتے ہی سارا کاروبار بند ہو جاتا ہے۔"

"غالباً سردیوں کی وجہ سے لوگ جلدی چلے جاتے ہیں۔"

"پچھلی سردیوں میں تو ایسا نہیں تھا!"

"پچھلی سردیوں میں دنیا کے حالات بھی تو ایسے نہیں تھے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے تائید کی۔ "واقعی دنیا کے حالات پھر بگڑتے جا رہے ہیں لگتا ہے تیسری جنگِ عظیم چھڑ ہی جائے گی۔"

"مسئلہ تو یہی ہے کہ جنگ بھی شروع نہیں ہوتی"۔

"جنگ کی دُعا نہ کریں صاحب"۔ اس نے کچھ ہولتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب کے اگر جنگ ہوئی تو دنیا ختم ہو جائے گی"۔

"اچھا ہے نا سارے مصائب سے نجات مل جائے گی"۔

"مصیبت اور پریشانیوں کے باوجود دنیا بہت اچھی جگہ ہے صاحب، اور جنگ وغیرہ غلط بات ہے"۔

"دنیا کیا خاک اچھی جگہ ہے، رات ایک بجے اسٹاپ پر کھڑے سڑ رہے ہیں اور....."

وہ جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ایکدم چیخا۔ "ٹیکسی، اوئے ٹیکسی"۔ اور پھر وہ چھلانگ مار کر بھاگا۔ ٹیکسی آگے جا کے رک گئی۔ اس میں دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ اس نے ٹیکسی کے قریب پہنچ کر جھک کر ڈرائیور سے کچھ پوچھا اور پھر وہیں سے آواز دی۔ "آجائیے جناب۔ اُسی طرف جا رہی ہے"۔

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے، تیسری جنگِ عظیم چھڑ جائے گی"۔

"ٹیکسی کے چل پڑنے کے بعد اس نے وہیں سے سلسلۂ کلام کو جوڑنا چاہا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"پتہ نہیں بھئی، میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں، ممکن ہے چھڑ جائے، ممکن ہے نہ چھڑے"۔

"آجکل اخبارات میں خبریں تو بڑی تشویشناک چھپ رہی ہیں۔ پولینڈ میں روسی فوجیں آنے والی ہیں، امریکہ نے دھمکی دے دی ہے۔ شام نے اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ لیبیا صدر ریگن کو قتل کرانا چاہتا ہے اور اندرا گاندھی بھی"۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا، کچھ بھی نہیں ہوتا، سمجھے"۔ ٹیکسی میں پہلے سے موجود موٹے شخص نے جس کی توند سیٹ میں تقریباً پھنسی ہوئی تھی۔ پان چباتے ہوئے بے فکری سے کہا۔ ہونا ہوتا تو میاں، ہو چکا ہوتا"۔

"معاف کیجئے۔ میں کچھ عرض کروں۔ چوتھے اور منحنی آدمی نے کھنکھار کر اجازت طلب کی۔

"بولو، خو تم نے کیا گناہ کیلا ہے، تم بھی بولو۔" ڈرائیور نے جو پٹھان تھا، منحنی آدمی کی ہمت افزائی کی اور اس نے کہا :

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ....."

"ارے میاں چھوڑیئے اپنی ذاتی رائے"۔ موٹے نے بات کاٹ دی۔ "میں بتاتا ہوں، برنس روڈ پر تین سال سے لسّی کی دکان پر بیٹھ رہا ہوں، کرم ہے اللہ کا اپنی دکان ہے ہر آنے جانے والے کی بات سنتا ہوں۔ اِدھر تین سال سے تیسری جنگِ عظیم کا کھڑاگ سن رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی دمادم شروع ہو جائے گا لیکن کچھ نہیں ہوتا میاں کچھ نہیں ہوتا"۔ موٹے نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"کسی مائی کے لال میں لڑنے کا دم نہیں ہے، نہ روس میں نہ امریکہ میں۔ اس لئے کہ ایک مرے گا تو دوسرا بھی مارا جائے گا۔ سمجھے میاں"۔

"جی ہاں، بالکل یہ تو ہے"۔ منحنی آدمی نے تائید کی۔ "لیکن سوچنے کی بات ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے"۔ ؟"

"کیوں ہو رہا ہے یہ سب؟" مفلر والے نے پوچھا۔

"اس لئے کہ مسلمان ننانوے کے پھیر میں پڑ گئے ہیں"۔ منحنی آدمی نے کہا۔ "اللہ میاں نے مسلمانوں کو ہر قسم کی دولت اور وسائل دیئے مگر مسلمانوں کو دولت نے خراب کر دیا اور وہ عیاشیوں اور برائیوں میں پڑ گئے"۔

"بالکل یہ بات بالکل درست ہے، ہمارے حضورؐ نے بھی یہی پیش گوئی فرمائی تھی"۔ مفلر والے نے پُرجوش طریقے سے حمایت کی۔

"خان صاحب! ذرا سائیڈ کے شیشے چڑھا دو، ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے"۔ منحنی آدمی نے سردی سے کپکپاتے ہوئے درخواست کی۔ ٹیکسی کے اندر موجود فضا کچھ بوجھل سی ہو گئی اور لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی۔ ٹیکسی اب شاہراہِ فیصل پر دوڑ رہی تھی۔

"صاحب یہ سڑک تو بڑی شاندار بن گئی ہے، کنارے پر لوہے کے جنگلے بھی لگائے جا رہے ہیں"۔

"چار دِن کی نمائش ہے میاں۔ دیکھ لینا تھوڑے دِنوں بعد سارے جنگلے غائب ہو جائیں گے"۔ موٹا بولا۔

"ہاں صاحب اور کیا'۔ یہی تو اخلاقی زوال ہے" یہ نہیں سوچتے کہ پبلک کے فائدے کی چیز ہے' اسکول کے بچے فٹ پاتھ سے گزرتے ہیں۔ یہ جنگلہ اُن کی حفاظت کرتا ہے"۔

"میاں ساری حفاظت امیروں اور دولت مندوں کے بچوں کی ہوتی ہے' اُن کیلئے زیبرا کراسنگ بھی بنتا ہے اور بورڈ بھی لگایا جاتا ہے کہ" آہستہ یہاں اسکول ہے" لیکن میاں ذرا بتائیے کہ ایئر پورٹ سے آگے اندھیرا کیوں ہے۔ سڑک ڈبل کیوں نہیں ہوتی، لائٹ کیوں نہیں لگائی جاتی۔ وہاں سے کیا انسان کے بچے نہیں گزرتے"۔

صاحب' افسران کی حکومت ہے' بیوروکریسی کی۔ ہم آپ کیا بیچتے ہیں اُن کے آگے"۔ منحنی آدمی نے تلخی سے کہا۔

"خو آپ لوگ پڑھا لکھا ہے، اَم ایک بات آپ سے بولے"۔ ڈرائیور نے مداخلت کی۔

"بالکل بولئے خان صاحب' آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے"۔

"یہ مسلمان لوگ ہے نا' اس میں بس ایک گڑبڑ ہے"۔ خان صاحب نے مفکرانہ انداز میں فرمایا۔ "یہ ہر موافق بات میں کیڑا نکالنے کا عادی ہے، ہر بات غلط' ہر بات غلط' خو ہر بات اگر غلط ہے تو پھر ٹھیک کیا ہے؟"

"واہ کیا نکتہ ہے"۔ منحنی آدمی نے اپنی نشست سے اچھل کر تائید کی۔ شاید اُسے سب سے آخر میں اُترنا تھا لیکن ایک لمحے کو سب سوچ میں پڑ گئے کہ واقعی اگر ہر بات غلط ہے۔ تیسری عالمی جنگ' پولینڈ میں مارشل لا، عراق کا اعلانِ جنگ، ریگن کو قتل کرنے کی کوششیں' اسلحے کی دوڑ اور اس سمیت ساری باتیں غلط ہیں تو پھر ٹھیک کیا ہے؟ ٹیکسی سڑک کے سینے پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

(۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء)

میرا گھر میری جنّت

ایک دن کیٹس کی ایک نظم کی تشریح کرتے کرتے اچانک انھوں نے کہا۔
"ایک غزل کہی ہے، سنیں گے آپ لوگ؟"
"سُنائیے"۔ پوری کلاس بیک آواز چلائی۔
"شعر ہے..." انہوں نے کھنکھار کر آواز درست کی۔
"اِرشاد!"

ے میرا ہی مکاں نہیں تو کیا ہے
اِس شہر میں بے شمار گھر ہیں

"واہ بہت خوب!" سب نے داد دی۔

"شاہد اختر صاحب لگتا ہے کرائے کے مکان میں رہتے ہیں"۔ کسی نے سرگوشی کی۔ بعد میں اِس سرگوشی کی تصدیق ہو گئی۔ استاد موصوف نے تین گھر بدلنے کے بعد اپنی بے گھری کا ماتم کیا تھا اور ماتم بھی کہاں کیا تھا۔ نیلے پیلے اُودے رنگوں کے خوبصورت جدید طرز کے بنگلوں کو دیکھ کر انھیں اپنی بے گھری کا صرف احساس ہوا تھا۔ اور یوں انہوں نے اپنے آپ کو تسلّی دی تھی۔

ہاؤسنگ اسکیموں کے اشتہارات پڑھ کر اور کرائے کے مکانات میں رہنے والے لوگوں سے مل کر دا نعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید زندگی کے چند گنے چُنے خوابوں میں ایک خواب اپنے مکان کی تعمیر کا بھی ہے۔ ایک ایسا مکان جس کی کھڑکیاں آپ کی مرضی سے ہوا کے رُخ پر کھولی گئی ہوں۔ مکان میں ڈرائنگ، ڈائننگ روم اور ٹی وی لاؤنج کے علاوہ

چھوٹا سا لان بھی ہو اور ہر ماہ مالک مکان کو تنخواہ میں سے ایک بڑی رقم حوالے نہ کرنی پڑے۔

لگتا ہے تجارت پیشہ افراد لوگوں کے خواب پڑھنے میں بے حد مہارت رکھتے ہیں انہوں نے یہ بھانپنے کے بعد کہ اپنا مکان ہر شخص کی بنیادی ضرورت اور پہلا خواب ہے ہاؤسنگ اسکیموں کا چکر چلایا۔ اُن میں چند تو دیانتدار تھے اور بیشتر بددیانت اور ٹھگ۔ وہ اپنی چالاکی اور عیاری سے راتوں رات لکھ پتی اور کروڑپتی بن گئے۔ ان کی جعلی رسیدیں وصول کرنے والوں کی اکثریت آج بھی خوبصورت بنگلوں اور عالیشان کوٹھیوں کے نزدیک سے گزرتی ہے اور اُن میں سے جو اس شعر سے واقف ہیں، وہ ایک آہِ سرد بھر کر ان بنگلوں پر نگاہِ افسردہ ڈال کر یہی شعر پڑھتے ہیں۔:

میرا ہی مکاں نہیں تو کیا ہے
اس شہر میں بیشمار گھر ہیں

ہمیں ذاتی طور پر تو کرائے کے مکان میں رہنے کا تجربہ نہیں لیکن کرائے داروں کی حالت دیکھ کر اپنے مکان میں رہنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہماری ملاقات ایک ایسے ہی کرایہ دار سے ہوئی۔ ہم نے پوچھا۔

"کرائے کے مکان میں کب سے ہیں؟"

"یاد نہیں۔ آنکھ کھولی تو اسی مکان میں تھا۔ شاید آنکھ بند ہوگی تو بھی اسی مکان میں ہوں گا۔"

"اس مکان میں کیا تکلیف ہے"۔

"مکان میں کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہے لیکن ہر ماہ کے خاتمے پر ایک آدمی آتا ہے، وہ شدید تکلیف دہ ہے"۔

"لیکن وہ مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے، پورے مہینے تو آرام رہتا ہے"۔

"جناب وہ صرف ایک بار آتا ہے مگر پورے مہینے کا سکون لوٹ کر لے جاتا ہے"۔

"آپ اپنا مکان کیوں نہیں بناتے"۔

"آپ کو پتہ ہے کہ اپنا مکان بنانے کا کیا مطلب ہوتا ہے"۔
"اپنا مکان بنانے کا مطلب ایک ایسا مکان تعمیر کرنا ہے جو صرف اور صرف آپ کا ہو"۔
"مجھ جتنی تنخواہ کا آدمی اگر اپنا مکان بنائے تو وہ کبھی صرف اور صرف اس کا اپنا نہیں ہو سکتا"۔
"وہ کیسے؟"
"ایسا مکان آدھا ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا ہوتا ہے، نصف دفتر کا اور نصف اپنا ہوتا ہے"۔
"آپ نے کبھی کے ڈی اے کی اسکیموں میں پلاٹ حاصل کرنے کی کوشش کی؟"
"کئی بار کی تھی"۔
"پھر کیا ہوا؟"
"کچھ بھی نہیں، ہونا کیا تھا"۔
"کیوں پلاٹ نہیں نکلا۔؟" "جی نہیں"۔
"تو پھر پلاٹ کس کے نام نکلا"۔
"ان کے نام جن کے پاس پہلے ہی کئی پلاٹ تھے"۔
"پھر آپ کے پاس کیا ہے؟"
"میرے پاس کہانیوں اور افسانوں کے کئی پلاٹ ہیں۔ آپ کو چاہئیں؟"
"پھر آپ افسانے کیوں نہیں لکھتے؟"
"افسانوں کو صرف پڑھا جا سکتا ہے، اُن میں رہا نہیں جا سکتا"۔
"رہنے کے لئے خیالی جنت کافی نہیں ہے"۔
"جی ہاں کافی ہے، گزشتہ تیس بتیس سال سے اُسی میں ہوں۔
"مزے میں ہیں؟ خوش ہیں؟"
"جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ ہے، بس کبھی کبھی بیوی بچے یاد آجاتے ہیں"۔

"انھیں بھی وہیں کیوں نہیں بُلا لیتے؟"

"بلایا تھا' آنے سے انکار کر دیا۔ کہا' ہمیں خیالی جنّت نہیں، گھر کی جنّت چاہیئے۔ میرا گھر میری جنّت"۔

"کیا کرائے کا مکان جنّت میں تبدیل نہیں ہو سکتا"۔

"نہیں ہو سکتا"۔

"وہ کیوں؟"

"کئی بار کرائے کے مکان کو جنّت بنانا چاہا لیکن مہینے کے آخر پر ایک ناپسندیدہ شخص آ کر اس جنّت کو تباہ کر دیتا ہے۔ پہلے وہ اس جنّت کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ پھر اس کی کھڑکیوں، دروازوں اور دیواروں کا جائزہ لیتا ہے کہ کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی یا برباد تو نہیں ہوئی اور جاتے جاتے اس جنّت کی حفاظت پر وہ ایک عدد لیکچر جھاڑتا ہے اور احسان جتاتا ہے کہ نہایت کم کرائے میں اس نے ہمیں رہنے کی اجازت دی ہے ورنہ ہم شہر میں دربدر مارے پھرتے۔ اس طرح یہ جنّت ہماری نہیں رہتی۔ ہمارے لئے خواہشوں کا جہنم ہی کافی ہے"۔

"خواہشوں کا جہنم کیا ہوتا ہے؟"

"ایسے جہنم میں جہاں بڑی بڑی دیگوں میں شاندار قسم کی خواہشوں کا پکوان تیار ہوتا ہو اور جس کو جلدی جلدی نگلنے میں منہ جل جاتے ہوں' اُسے خواہشوں کا جہنم کہتے ہیں"۔

"آپ خواہشوں کے گرما گرم پکوان کو ٹھنڈا کر کے کھایا کریں' منہ نہیں جلیں گے"۔

"آپ کے مشوروں کا بے حد شکریہ آئندہ ایسا ہی کروں گا"۔

"کیا آپ کی بیوی اور بچّے بھی خواہشوں کے جہنم میں رہتے ہیں؟"

"صرف بیوی رہتی ہے' بچوں کو میں نے آنے سے روک دیا"۔

"کیوں بچّوں کو کیوں روکا؟"

"بچّے کمزور ہوتے ہیں' وہ برداشت نہیں کر پائیں گے"۔

"خاصی ذہانت سے کام لیا!"

"جی ہاں کام لینا ہی پڑتا ہے۔ بچوں کا معاملہ ہے نا" یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

(۱۲، نومبر ۱۹۸۱ء)

کچھ آغا شاہی اور مسرت شاہین کی بابت

آج کے اخبار میں دو سنسنی خیز خبریں شائع ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وزیرِ خارجہ آغا شاہی مستعفی ہو گئے اور دوسری یہ کہ اداکارہ مسرت شاہین شعر کہنے لگیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دونوں خبروں میں سے کون سی خبر دوسری خبر کے بننے کا باعث ہوئی ہے یعنی آغا شاہی مسرت شاہین کے شعر کہنے کی اطلاع پاکر مستعفی ہوئے یا مسرت شاہین ان کے استعفے کی اطلاع سُنکر شعر کہنے لگیں۔ بہر کیف اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان دونوں حادثوں کی پیشگوئی پروفیسر کوکب سالِ نو کے آغاز ہی میں کر چکے تھے۔ پروفیسر صاحب کے بقول ۱۹۸۲ء میں پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں پہلے جیسا رہے گا اور ملک میں شاعری پر زوال آئے گا۔ شاعری پر زوال کی پیشگوئی سے ہم نے یہ مطلب نکالا تھا کہ مبارک احمد نثری نظم کی حمایت سے دست کش ہو جائیں گے لیکن مسرت شاہین کے شعر کہنے کی خبر پڑھ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیش گوئی کا جو مطلب ہم نے سمجھا تھا وہ غلط ثابت ہوا اور شاعری پر ابھی اتنا زیادہ بھی زوال نہیں آیا ہے۔

آغا شاہی کے مستعفی ہونے پر ہمیں افسوس اور مسرت شاہین کے شاعرہ بن جانے پر خوشی ہے۔ افسوس اس لئے کہ ہمیں نہ جانے کیوں آغا کہلانے والے لوگ اچھے لگتے ہیں مثلاً پرنس کریم آغا خان آغا حمید، آغا شورش کاشمیری، آغا یحییٰ۔ ان تمام "آغاؤں" کو دیکھ کر بیساختہ ہم خوشی سے کہہ اٹھتے ہیں۔ "آہاہ!" ہمارے خیال میں بیرونی دنیا میں آغا شاہی اور پاکستان کا جتنا بھی وقار بلند ہوا ہے۔ اس میں بڑا ہاتھ اسی لفظ "آغا" کا رہا ہو گا، کیونکہ لفظ "آغا" نہایت باوقار لفظ ہے اور اسے سنتے ہی خود بخود احتراماً سر سے ٹوپی اتارنے کو جی چاہتا ہے۔

رہا سوال اداکارہ مسرت شاہین کے شاعرہ بن جانے کا، تو صاحب بڑی بوڑھیوں نے قربِ قیامت کی جو نشانیاں بتائی تھیں، ان میں شاید یہ نشانی بتانا بھول گئی تھیں کہ مسرت شاہین

شعر کہیں گی اور اخبارات میں خبریں چھپیں گی۔ مسرت شاہین نے جو شعر کہا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ

یوں تو ہزاروں سانپ راہِ زندگی میں ملیں گے
خدا کرے کوئی زیرِ آستیں نہ ملے!

اس شعر کے محاسن و عیوب پر غور کرنا تو کسی نقاد ہی کا فرض ہے لیکن اس خوف سے کہ اس شعر کو اور مسرت شاہین کی غزلوں کو کہیں شاملِ نصاب نہ کر دیا جائے، ہم مختصراً اس شعر کے صرف "عیوب" کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیں گے اور بعد ازاں ادارہ تشکیل و تدوین و توسیعِ نصاب کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس شعر کو محض شاعرہ کی شہرت سے متاثر ہو کر ہرگز دسویں کے نصاب میں شامل نہ کریں کیونکہ اس شعر میں سانپوں کی بلاضرورت پبلسٹی کی گئی ہے اور پھر راہِ زندگی میں ملنے والے سانپوں کا زیرِ آستین پرورش پانے والے سانپوں سے موازنہ کر کے سانپوں کے درمیان طبقاتی کشمکش کو ہوا دی گئی ہے جو کہ ناپسندیدہ بات ہے۔

آغا شاہی کے استعفٰے کا افسوس تو خیر اس وقت تک باقی رہے گا۔ جب تک کہ انہیں حکومت میں وزیرِ خارجہ ہی کی اہمیت کا کوئی دوسرا عہدہ نہ مل جائے اور مسرت شاہین کے شاعرہ بننے کی خوشی کا تاثر بھی ختم نہیں ہوگا تاوقتیکہ اس مسرت میں دیگر شعراء اور ادیب شامل نہ ہو جائیں۔ فیض احمد فیض کے ایک مداح کہنے لگے کہ اگر یہ اطلاع فیض تک پہنچ گئی کہ مسرت شاہین بھی شعر کہنے لگی ہیں تو یقیناً وہ بھی آغا شاہی کی طرح فنِ شاعری سے مستعفی ہو جائیں گے۔

کالم اور کالم نویسی

جب کوئی دوست کسی کالم نگار کا ذکر چھیڑ کر کہتا ہے کہ آج فلاں کا کالم، خشک اور بے مزہ تھا۔ پڑھ کر لطف نہیں آیا تو جانے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید قارئین کی بڑی تعداد کالم نگار کو مسخرا تصور کرتی ہے جو ہر صبح مختلف رنگوں والی لمبی ٹوپی پہنے، چہرے پر ماسک سجائے اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے انہیں ہنساتا رہے گا۔ اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو یہ بڑی افسوسناک بات ہے اور یہ جو پڑھنے والے کالم نگاروں سے کھٹی میٹھی رسیلی اور مزیدار باتوں کی توقع کرتے ہیں۔ یہ صورت حال کسی بھی باوقار کالم نویس کے شایان شان نہیں ہے۔ پڑھنے والوں کو سوچنا چاہیئے کہ آخر کالم نگار بھی انسان ہوتا ہے، اُسے غصہ بھی آتا ہے۔ وہ کبھی کبھی رونا بھی چاہتا ہے۔ ناراض ہو کر چیخنے چلانے بھی لگتا ہے لیکن تب قارئین بُرا سا منہ بنا کر کہتے ہیں۔ "نہیں بھئی، یوں نہیں"۔ میرا خیال ہے ایک خوددار کالم نویس کو ایسے لمحے میں کہنا چاہیئے۔ "کیوں مسٹر؟ آخر ایسا کیوں نہیں! براہ کرم آپ تشریف لے جائیے اور جو میں لکھ رہا ہوں، لکھنے دیجئے؟"

ایک کالم نگار کو کیا لکھنا چاہیئے؟ کیا اُسے ہمیشہ قارئین کو مدنظر رکھ کر لکھنا چاہیئے یا انہیں نظر انداز کر کے صرف اپنے دل کی باتیں لکھنی چاہئیں؟ یہ سوالات ایسے تمام کالم نگاروں کیلئے انتہائی موزوں ہیں جنہیں ہر صبح اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہونے کے جبر کا سامنا درپیش ہے۔ کالم نگار کا اپنا ایک ذہنی موسم ہوتا ہے۔ خوشگوار اور تر و تازہ موڈ میں وہ بے تحاشا باتیں لکھتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کا دل و دماغ یکایک بنجر زمین میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی اپنی کیفیت ایک ناپوس

کسان یا بانجھ عورت جیسی ہو جاتی ہے، آپ تصور کیجئے کہ تب بھی اُسے لکھنا ہی پڑتا ہے ہر روز لکھنے کا جبر۔ میرے خدا! اس کا تصور ہی کتنا ہولناک ہے۔

الحمدللہ کہ مذکورہ بالا مسائل ہمارے بیشتر کالم نویسوں کو درپیش نہیں ہیں جتنی شدت سے میں نے بیان کیا ہے۔ بعض تو سیاسی کالم نگار ہیں جو اپنے کالم کی لاٹھی سے سپ سیاست کو ہانکنے کا کام لیتے ہیں، وہ غریب ٹس سے مس نہیں ہوتا تو اس کے کان پکڑ کر اور دُم مروڑ کر آگے بڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سیاست کی گہما گہمی کے زمانے میں اُن کی مانگ بڑھ جاتی ہے لیکن بازارِ سیاست کے سرد پڑتے ہی اُن کی پھلجڑیاں بھی جل بجھتی ہیں۔ بعض "گپاشک کالم نویس" اپنے کالموں میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ لگائی، ایک آدھ لطیفہ سنایا اور چل دیئے۔ لوگ لطیفے سننے کے شوق میں ہوتے ہیں لہٰذا ایسے کالم پڑھ کر بھی خوش ہوتے ہیں چند ایک کالم نویس کالم کیا لکھتے ہیں، بس لٹھ گھماتے ہیں، کسی موضوع کو چمٹے سے اٹھایا، تماشائیوں کو دکھایا اور پھر پل پڑے۔ یہ دھینگا مشتی اتنے زوروں پر ہوتی ہے کہ قاری اگلے پیراگراف سے پہلے ہی بوکھلا کر صفحے پر کوئی ہلکی پھلکی چیز تلاش کرنے لگتا ہے تاکہ ذہن پر چھانے والے بوجھ کو اتار پھینکے۔ کچھ کالم نویس جنھوں نے دنیا اور دنیا کے اچھے دن دیکھے ہوتے ہیں۔ لارڈ فلانے کے ساتھ شام کی چائے پی چکے اور نواب ڈھماکے کے ہمراہ بٹیر لڑا چکے ہوتے ہیں ان کا فریضہ اپنے کالموں کے ذریعے اپنے ماضی کی یاد زندہ کرنا ہوتا ہے۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب" کی طرز پر لکھنے والے بڑے بوڑھوں میں مقبولیت کا ڈائمنڈ جوبلی ہفتہ منا چکے ہوتے ہیں کیونکہ پیری میں آنکھیں مُوندنے سے قبل تک ماضی کے دریچوں سے جھانکنا بھلا لگتا ہے اور ایسے منظر دکھانے والوں کی صحبت ماضی کے دوستوں کی صحبت کے مترادف ہوتی ہے۔ ایک آدھ کالم نویس ایسے بھی ہیں جو سنجیدگی اور متانت کو مزاح اور لطیفہ گوئی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا مزاج یا تو بنیادی طور پر خشک ہوتا ہے یا پھر فلسفیانہ۔ خشک مزاج کالم نویس تو اگر لطیفہ گوئی کی بھی سعی کرتے ہیں تو رونا آتا ہے اس کے برعکس فلسفیانہ مزاج کالم نویس ہر موضوع کو انفس و آفاق کے تناظر میں دیکھنے اور ان کا عالمانہ طرز میں اظہار کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے کالم نویسوں کی اپنی انفرادیت

اور ایسے کالموں کی اپنی علیحدہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ بدقسمتی صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ اُن کے قارئین کی تعداد انگلیوں پر گِنی جا سکتی ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بعض اوقات دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تعداد میں ان کے قارئین سے زیادہ ہوتی ہیں۔

کالم نویسی بسا اوقات یونانی اساطیر کے شہرۂ آفاق کردار سسی فس کی سزا بن جاتی ہے جسے دیوتاؤں نے ایک بھاری چٹان کو بلندی تک پہنچا کر لڑھکانے اور پھر اسے اٹھا لے جانے کی بے معنی تکرار میں مبتلا کر دیا تھا۔ گو کالم نویسی بے معنی عمل نہیں لیکن ایسے کالم نویس جو جمود کا شکار نظر آئیں وہ اخباری دنیا کے سسی فس ہوتے ہیں۔

میں چونکہ خود بھی ایک کالم نگار ہونے کا دعویٰ رکھتا ہوں اور میری خود پسندی اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے کچھ اپنے بارے میں کہنے پر اکسا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے مجھے برداشت کیجئے اور کالم نویسوں کے اس قبیل میں شامل سمجھئے جو خود نمائی سے خوش رہتے ہیں۔ ان کی خوشی کا ایک اور پہلو ہے کہ اُن کے پڑھنے والے بہت ہیں۔ مجھے اس بات سے اتنی دلچسپی نہیں ہے کہ مجھے کتنے لوگ پڑھتے ہیں جتنی اس امر سے کہ مجھے کتنے اچھے لوگ پڑھتے ہیں۔ بہت سے اہلِ قلم حضرات کے نزدیک میرے بہت سے کالم ممکن ہے کالم ہی نہ ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کالم نہ لکھے جاتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اس وقت میں سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا.... حالانکہ میں لکھنے کے دوران سوچتا نہیں (اور اس پر مسکرانا فضول ہے، میرے قارئین پہلے ہی واقف ہیں!) میں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں پہ دلجمعی کے ساتھ لکھ سکتا ہوں جو بظاہر غیر اہم یا پھر انتہائی ذاتی ہوتی ہیں۔ میں بُرا لکھنے سے نہیں ڈرتا (اگر ڈرتا تو کب کا لکھنا چھوڑ چکا ہوتا) اس کا خوف مجھے ضرور رہتا ہے کہ کہیں میں کبھی کبھار اچھا لکھنے سے بھی نہ جاتا رہوں۔

کالم نویسی میرا وقتی مشغلہ ہے۔ اس مشغلے سے میں اس وقت اُکتا جاؤں گا جب قارئین مجھے پڑھنا چھوڑ دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ قارئین مجھے پڑھنا نہیں چھوڑیں گے کیونکہ ابھی تو انہوں نے مجھے پڑھنا شروع بھی نہیں کیا ہے۔